پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری

مقالہ برائے ایم۔فل

مقالہ نگار

سنیل کمار

نگراں

پروفیسر مظہر حسین مہدی

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لنگویجز، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی–110067

2018

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 18 /07/2018

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this M.Phil dissertation entitled *Prem Nath Dar ki Afsana Nigari* (*The Short Story of Prem Nath Dar*) by me is an original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution.

Sunil Kumar
Sunil Kumar
(Research Scholar)

Prof. Mazhar Hussain Mehdi
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Gobind Prasad
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

مشمـــــولات

پیش لفظ 5-7

باب اول

پریم ناتھ در کے عہد میں کشمیر کی ادبی، سیاسی وسماجی صورتحال 8-51

(الف) پیدائش، تعلیم وادبی خدمات

(ب) ادبی صورتحال

(ج) سیاسی صورتحال

(د) سماجی صورتحال

باب دوم

پریم ناتھ در کے فکشن میں کشمیری عوام کے مناظر..... 52-68

(الف) کشمیری عوام کے مناظر

(ب) زندگی کی حقیقی تفسیریں

باب سوم

پریم ناتھ در کے فکشن میں ہنگامی موضوعات 69-88

(الف) قبایلی حملے کے واقعات

(ب) جنگی صورتحال

(ج) شرناتھیوں کی صورتحال

باب چہارم

پریم ناتھ کے افسانوں کا فن اور تکنیک 89-105

(الف) فن و تکنیک کا تعارف

(ب) پلاٹ

(ج) کردار

(د) اسلوب

(ہ) زبان

حاصل کلام 106-109

کتابیات 110-112

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر شروع سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔اس سرزمین سے نامور دانشور، مایہ ناز شاعرو ادیب اور کئی ایسے قدر آور فنکار پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور اپنے علم وفن سے عالمی سطح پر اس ریاست کو روشناس کروایا ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں دہائی سے ریاست میں افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ نظر آتا ہے۔ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا۔انھوں نے اجتماعی شعور، نفسیاتی بصیرت،فنی دلکشی اور تکنیک کے نئے تجربوں کے ذریعے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے نئی راہیں دکھلائیں اور ساتھ ہی کشمیر کے پس منظر میں رومان وحقیقت کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کیا اور ان دونوں کے درمیان اعتدال وتوازن برقرار رکھا۔اسی دوران ریاست جموں وکشمیر میں پریم ناتھ در نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ریاست میں اردو افسانے کے فنی معیار کو بلند کرنے اور اسے ارتقا کی نئی منزلوں سے ہمکنار کرنے میں پریم ناتھ در کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ان کا شمار ریاست کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے غریب عوام کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں کشمیر کے رسم و رواج، رہن سہن، وہاں کے کھانوں، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ پریم ناتھ در کا مشاہدہ بہت ہی گہرا ہے۔ وہ عوام کی بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک پہنچتے ہیں اور ان حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں جنھوں نے عوام کو افلاس اور بھوک کی طرف دھکیل دیا ہے۔ ساتھ ہی کشمیر کے دیگر ہنگامی موضوعات اور سیاسی اتھل پتھل کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن سے وہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی صورتحال کی جھلکیاں ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔

میرا یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں پریم ناتھ در کے عہد میں کشمیر کی ادبی، سیاسی و سماجی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے، جس میں، میں نے اس دور کے کشمیر کی معاشرتی زندگی، وہاں کی ادبی صورتحال اور سیاسی اتھل پتھل کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرے باب میں، میں نے پریم ناتھ در کے ان افسانوں کے حوالے سے بات کی جو کشمیر کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں غریب کشمیری عوام کے دکھ درد، ان کے مسائل و مصائب، ان کی زبوں حالی و تنگ دستی کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان افسانوں میں وہاں کا رہن سہن، عادات و اطوار، رنگ برنگ کھانے پینے سے متعلق چیزوں کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ پریم ناتھ در ایک حقیقت نگار تھے۔ انھوں نے وہی لکھا جو انھوں نے اپنے معاشرے میں دیکھا اور محسوس کیا۔ زیر نظر مقالہ میں اس باب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ پریم ناتھ در کے افسانوں کے موضوعات اور ان کے مسائل کیا ہیں۔

تیسرے باب میں پریم ناتھ در کے ان افسانوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ جو ہنگامی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ اس باب میں، میں نے ہنگامی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے جس میں قبایلی حملے کی واردات، مہاجروں کا رہن سہن اور ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہوئی جنگ کی روداد پیش کی ہے۔

چوتھے باب میں پریم ناتھ در کے فن اور تکنیک کے حوالے سے بحث کی گئی ہے جس میں ان کی کہانی کے پلاٹ، کردار نگاری، اسلوب، زبان و بیان کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور اس گفتگو میں تمام فنی لوازم کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

حواشی اور حوالہ جات کو فٹ نوٹ میں درج کرنے کے بجائے ہر باب کے آخر میں ترتیب وار درج کیا گیا ہے اور کتابیات کے تحت سب سے پہلے بنیادی ماٰخذ اور اس کے بعد ثانوی ماٰخذ اور پھر رسائل و جرائد کی فہرست ترتیب دی گئی ہے۔

آخر میں اپنے نگراں پروفیسر مظہر مہدی کا دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں، جنھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میری رہنمائی کی اور اس مقالے کی تیاری میں شروع سے آخر تک ہر مقام پر میری

حوصلہ افزائی کی۔ مواد کی دستیابی اور موضوع سے متعلق جو بھی مسائل پیش آئے مشفق استاد نے اپنے گراں قدر مشوروں سے انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔

استاد محترم کے بعد اس مقالے کی تیاری میں جنھوں نے میری سب سے زیادہ مدد کی وہ جگ پرکاش در ہیں۔ جگ پرکاش در، پریم ناتھ در کے لائق فرزند ہیں۔ انھوں نے بعض اہم اور معلومات افزا مواد کی فراہمی کے ساتھ پریم ناتھ در کی ذاتی زندگی سے متعلق بعض ایسی اطلاعات فراہم کیں جو مجھے کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی تھیں لہٰذا میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

اسی کے ساتھ میں اپنے سینئر امتیاز احمد اور روی کانت کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کی تزئین وآرائش کے سلسلے میں میری رہنمائی کی اور اس کی تیاری کے سلسلے میں موقع بہ موقع مفید مشوروں سے نوازا۔

آخر میں، میں اپنے دادا دادی جو ابھی چند مہینے قبل یکے بعد دیگرے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، کی بے لوث محبتوں اور دعاؤں کو یاد کرتا ہوں تو آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔ وہ ہمارے لیے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے تھے جن کے سایے تلے ہمارا وجود ہمیشہ محفوظ اور مطمئن تھا۔ مگر اب جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو میرے دل سے صرف یہ دعا نکلتی ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں ہمیشہ شاد رہیں۔ اسی کے ساتھ میں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کی محبتوں اور عنایتوں کا بھی شکر گزار ہوں جو میری کل کائنات ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی محبت اور مدد سے میں یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔ شکریہ کے کلمات ان کی محبتوں اور نوازشوں کے بدل نہیں ہو سکتے۔

میں نے اپنے اس مقالہ میں پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری کے ہر پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے اس کے باوجود بھی اس موضوع کے بعض گوشے تشنہ رہ گئے ہوں۔ تاہم تحقیق کے میدان میں ایک نو آموز کی یہ طالب علمانہ کوشش ہے۔ امید ہے کہ میری اس کوشش کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

سنیل کمار

باب اول

پریم ناتھ در کے عہد میں
کشمیر کی ادبی، سیاسی وسماجی صورتحال

پیدائش:

پریم ناتھ در کا تعلق کشمیری پنڈت گھرانے سے تھا۔ در کا شمار جموں وکشمیر کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ پریم ناتھ در کی پیدائش 25 جولائی 1914ء میں کشمیر کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ اسی سال ان کے والد کی وفات ہوئی۔ در اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت رام چندر اور والدہ کا جے مالا تھا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نیل کنٹھ نے کی۔ 1922ء میں ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ پریم ناتھ در نے اپنی پرائمری تعلیم ایس۔ پی۔ مڈل اسکول فتح کدل سے حاصل کی اور آگے کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایس۔ پی۔ کالج سری نگر میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے فلسفہ، انگریزی، تاریخ اور اردو میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت:

سنہ 1936ء میں پریم ناتھ در روزگار کی تلاش میں لاہور چلے گئے لیکن وہاں تحریک آزادی کے لیے کام کرنے لگے۔ یہ تحریک کشمیر کو ڈوگرہ راج سے آزاد کرانے کے لیے تھی۔ در نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1940ء میں جب وہ دہلی آئے تو یہاں ان کی ملاقات ہندوستان ٹائمز کے مدیر دیوداس گاندھی سے

ہوئی۔انھوں نے در کی قابلیت دیکھ کران کو ہندوستان ٹائمز میں کام کرنے کی پیشکش کی۔در کی عملی زندگی کا آغاز صحافی کی حیثیت سے ہوا۔ چار سال ہندوستان ٹائمز سے وابستہ رہنے کے بعد وہ اخبار اسٹیس مین (Statesman) سے وابستہ ہوگئے۔صحافت میں آٹھ سال گزارنے کے بعد پریم ناتھ در آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ وہاں ان کا تقرر ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے ''آواز'' کے مدیر کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں ترقی کی منزلیں طے کرکے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد 1975ء میں شیخ محمد عبداللہ نے ان کو اپنا مشیر برائے اطلاعات مقرر کیا۔وہ ایک سال تک اس عہدے پر رہے۔آخر کار 6 ستمبر 1976ء کو 62 برس کی عمر میں ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

شادی:

پریم ناتھ در جب لاہور میں تحریک آزادی سے وابستہ ہوئے تو وہ ایک مقبول کارکن کے طور پر ابھرے۔وہ لوگوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے جگہ جگہ تقریریں کیا کرتے تھے۔ایسے ہی 1940ء میں انھوں نے ایک بار وکٹوریہ پارک (موجودہ رام لیلا میدان) میں تقریر کی۔اس جلسے میں انھوں نے کشمیری برادری کو مخاطب کیا۔حاضرین میں کشمیری پنڈت گووند بھٹ بھی شامل تھے۔وہ اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے کہ پریم ناتھ در کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیٹی للتا دیوی کا ٹیوٹر مقرر کیا۔ بعد میں 9 مئی 1940ء کو للتا دیوی بھٹ سے ہی ان کی شادی ہوئی۔للتا دیوی نے دہلی یونیورسٹی کے اندر پرستھ کالج سے بی۔اے کیا تھا۔ پریم ناتھ در کی سات اولادیں ہوئیں پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے۔سب سے بڑی دو لڑکیوں کا کم عمر میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ بعد میں نرملا نرملا، یگ پرکاش در، پرگتی در، وینا کھنا اور جگ پرکاش در پیدا ہوئے۔اب یعنی 2018ء تک دو بیٹے یگ پرکاش در جگ پرکاش در اور بیٹی پرگتی زندہ ہیں۔

ادبی خدمات:

1936ء میں جب پریم ناتھ در لاہور گئے تو وہاں ان کی دلچسپی اردو ادب سے بڑھتی گئی۔لاہور ان دنوں ادب کا مرکز تھا۔وہاں ان کی ملاقات کئی ادیبوں سے ہوئی۔اس کے بعد جب پریم ناتھ در دہلی آئے یہاں پر بھی وہ ادبا کے درمیان میں ہی رہے اور ادبی محفلوں میں حصہ لیتے رہے۔اسی دوران انھوں نے اپنا

ادبی سفر شروع کیا۔ پریم ناتھ در نے عبادت بریلوی کے ساتھ مل کر دہلی میں حلقہ ارباب ذوق کی ایک شاخ کھولی۔اس حوالے سے جی۔آر۔حسرت گڈھا نے جگن ناتھ آزاد کی تحریر کو حوالہ بنا کر لکھا ہے کہ:

> 1946ء میں حلقۂ ارباب ذوق لاہور کی ایک شاخ کا قیام دہلی میں ہوا جس کے روح رواں در صاحب ہی تھے۔اس حلقے کی ہر ایک میٹنگ عربی کالج ہال دہلی میں ہوتی تھی۔حلقۂ ارباب ذوق کے بارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد ''آنکھیں ترستیاں'' میں لکھتے ہیں ''جب 1947ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آ گئے تو دہلی میں جو سب سے پہلے ادبی مجلس جمی تو وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھی۔ڈاکٹر عبادت بریلوی ان دنوں کالج میں پڑھتے تھے۔وہ پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔پریم ناتھ در نے ان کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔اس ادبی انجمن کا قیام جنوری 1946ء میں ہوا،اس کے پہلے سکریٹری میرا جی اور نائب سکریٹری اکرام قمر تھے۔اس کی مجلسوں میں اردو ادب کے نامور ادیب شرکت کرتے تھے۔(1)

پریم ناتھ در کا پہلا افسانہ ''غلط فہمی'' تھا جو 1946ء میں منظر عام پر آیا اس افسانہ کو انھوں نے حلقہ ارباب ذوق کی مجلس میں پڑھا۔اس حوالے سے جی۔آر۔حسرت گڈھا رقم طراز ہیں کہ:

> انجمن کی ہر محفل عربک کالج دہلی میں ہوتی تھی جس کی ہر میٹنگ میں پریم ناتھ در شامل ہوتے تھے۔اس حلقے کی ایک مجلس میں در صاحب نے اپنا پہلا افسانہ ''غلط فہمی'' پڑھا۔اس مجلس کی کارروائی میرا جی کر رہے تھے۔(2)

اس مجلس میں جو لوگ شامل تھے ان میں کئی لوگوں نے افسانے کی تعریف کی اور کچھ لوگوں کی طرف سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔لیکن یہ افسانہ ''غلط فہمی'' جب لاہور کے مشہور رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا جس کے مدیر صلاح الدین احمد تھے تو انھوں نے اس کے ساتھ یہ نوٹ لگایا کہ:

> پریم ناتھ در ہمارے افسانوی افق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے اور اگر وہ نوجوان ہے تو پھر ہمارے موجودہ استادوں کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا۔(3)

اس کے بعد پریم ناتھ در کے افسانے ملک کے مختلف ادبی رسالوں میں بھی چھپنے لگے۔ان کے دو افسانوی مجموعے ان کی حیات کے دوران ہی شائع ہوئے تھے۔ان کا پہلا مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' حلقہ ارباب ذوق شاخ دہلی کی طرف سے 1949ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں کل نو افسانے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) گیت کے چار بول، (2) دنوں کا پھیر، (3) تحلیل نفسی، (4) کوفتہ، (5) غلط فہمی، (6) جوان؟ (7) آخ تھو، (8) چڑھاوا، (9) کاغذ کا واسدیو۔

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''نیلی آنکھیں'' 1960ء میں منظر عام پر آیا اس مجموعہ کے ''اپنے منہ'' کے زیر عنوان میں پریم ناتھ در لکھتے ہیں کہ:

> میری افسانہ نویسی کے ماضی سے حال تک پہنچنے کے لیے عنوانوں کا یہ زینہ استعمال کیا جا سکتا ہے جی چاہے زینوں سے چڑھ آیئے۔ جی چاہے اتر آیئے لیکن تنقید نگاروں کو مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چڑھنے کی ضرورت ہے نہ اترنے کی۔ اس عنوان میں کشش ہے۔اسے وہ بھی پڑھیں گے جن کی آنکھیں نیلی ہیں اور وہ بھی جن کی اور رنگوں کی ہیں۔اسے وہ بھی پڑھیں گے جن کو نیلی آنکھوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ بھی جن کو ایسی آنکھوں سے چڑ ہے۔(4)

اس مجموعہ میں کل دس افسانے شامل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) نیلی آنکھیں، (2) بھوت پریت، (3) گدھ، (4) فائدہ بے فائدہ، (5) ویسے کا ویسا، (6) اترائی، (7) بیچ اندھیرے، (8) زندگی کا گھونٹ، (9) دودھ، (10) نیلی بوتل۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ ''دودھ'' در کے پہلے مجموعہ'' کاغذ کا واسدیو'' میں ''دنوں کا پھیر'' کے عنوان سے شامل ہے۔

پریم ناتھ در کا تیسرا مجموعہ جس کو جی۔آر۔حسرت گڈھ نے ترتیب دے کر ''چناروں کے سائے میں'' کے نام سے 1991ء میں شائع کروایا۔اس مجموعہ میں ایک مضمون پریم ناتھ در کے نام سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے تحریر کیا ہے۔اس مجموعہ میں پانچ افسانے ہیں جو پہلے اور دوسرے مجموعہ کے چند افسانوں کے ساتھ شامل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) پانی سے گاڑھا لہو، (2) کھڑکی، (3) بانکڑی کا ایک ٹکڑا، (4) لڑوی بس، (5) پانی کے پاس۔

اس مجموعہ میں ''چناروں کے سائے میں'' کے نام کا کوئی افسانہ نہیں ہے۔جی۔آر۔حسرت گڈھ نے اس میں کشمیر کا موضوع اور ماحول دیکھ کر اس کا نام ''چناروں کے سائے میں'' رکھا۔حال ہی میں پریم ناتھ در کے چھوٹے صاحبزادے جگ پرکاش در نے ان کے باقیات کو ''بے تال لمحے'' کے نام سے ترتیب دے کر مکتبہ جامعہ سے 2012ء میں شائع کروایا۔اس میں تین افسانہ ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) بے تال لمحے، (2) ایک کوئلہ جس کے رنگ ہزار، (3) سڑے پھسے ٹماٹر۔

''بے تال لمحے'' میں چند اور افسانے بھی شامل ہیں جو مجموعہ ''چناروں کے سائے میں'' پہلے ہی شامل ہیں جن میں ''پانی سے گاڑھا لہو''، ''بانکڑی کا ایک ٹکڑا''، ''لڑوی بس'' اور ''پانی کے پاس'' نام کے افسانے اس میں دوبارہ شامل کیے گئے ہیں۔پریم ناتھ در نے افسانوں کے علاوہ ایک ڈراما اور تین مضامین لکھے۔انھوں نے ''زگبڑ'' (دو بیٹے) کے عنوان سے 1969ء میں تین ایکٹوں پر مشتمل ایک ڈراما لکھا جو کہ کشمیری زبان میں ہے۔

اس ڈراما کا موضوع ہندووں اور مسلمانوں کا بھائی چارہ ہے۔اس کا رسم الخط اردو ہے اور اس کے پیش لفظ میں مصنف نے اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے کہ وہ کشمیری زبان میں بھی بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔لیکن انھیں ماحول ایسا ملا کہ جس کے باعث انہیں اظہار کے لیے دوسری زبانوں کا سہارا لینا پڑا۔اس کے علاوہ پریم ناتھ در نے جو مضامین لکھے ان میں:

(1) ''افلاطون کا تعلیمی فلسفہ'' جوانھوں نے حلقہ ارباب ذوق شاخ دہلی میں پڑھا تھا لیکن یہ مضمون میسر نہیں ہوسکا ہے۔

(2) کشمیری ساہتیہ پر گاندھی جی کا پربھاؤ: یہ مضمون پریم ناتھ در کے چھوٹے بیٹے جگ پرکاش سے مجھے ملا۔ یہ مضمون ابھی تک کسی بھی رسالہ یا کتاب میں شائع نہیں ہوا ہے۔اس مضمون کا زمانہ تحریر بھی اس پر درج نہیں ہے۔

(3) کشمیری شخصیت: یہ مضمون پریم ناتھ در نے رسالہ آج کل کے لیے تحریر کیا تھا جو اگست 1955ء میں کشمیر نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں کشمیر کی تاریخ، سماجی شخصیت اور ان کی دیانت، ذہانت، جفاکشی اور دوراندیشی کا ذکر کیا ہے۔ در کے فرزند کے مطابق انھوں نے ہندی میں بھی کہانیاں لکھی تھی لیکن ابھی تک وہ دستیاب ہی نہیں ہیں۔

پریم ناتھ در نے جب اپنے آپ کو آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ کیا تو وہاں بھی انھوں نے اردو زبان کی خدمات انجام دی۔ انھوں نے اپنی قوت اور پوزیشن کو اردو زبان کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ آزادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں اردو پروگرام خستہ حالی کے شکار تھے جن اسٹیشنوں سے کبھی اردو کے پروگرام ہوتے بھی تو وہ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔

اسی دوران دہلی میں کشمیر یونٹ قائم کیا گیا جو مختصر مگر دلچسپ پروگرام روزانہ سری نگر اور لیہہ بھیجتا تھا۔ پریم ناتھ در نے دہلی سے بھی روزانہ آدھ گھنٹے کا اردو پروگرام ''اردو مجلس'' کے نام سے جاری کیا۔ پریم ناتھ در سے پہلے اردو پروگراموں کا ڈھانچہ قدیم وجدید شاعری اور افسانوں سے تیار کیا جاتا تھا۔لیکن پریم ناتھ در نے اردو مجلس کو غزل اور افسانے سے باہر نکالا اور ایسے پروگرام کا خاکہ بنایا جس پر ادب کی کسی صنف کی چھاپ نہ ہو بلکہ اردو زبان ذریعہ اظہار ہو۔ ''اردو مجلس'' میں ہر موضوع پر اردو زبان میں پروگرام پیش کیے جانے لگے۔ ''اردو مجلس'' کے حوالے سے رفعت سروش لکھتے ہیں کہ:

> پریم ناتھ در نے ''اردو مجلس'' کے نام سے پروگرام جاری کیا جو کسی صنف سے باندھا نہیں تھا۔ اردو مجلس نے ہر موضوع پر پروگرام بنائے جن میں سماجیات، سیاست،

> سائنس، معاشیات، تاریخ، دیگر علوم وفنون۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جس کی نمائندگی اردو مجلس میں نہ ہو۔ اور پالیسی ترقی پسندانہ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بین الاقوامی مفاہمت، قومی یک جہتی، عوامی زندگی کے مسائل اس بنیادی ڈھانچے میں رنگ آمیزی آسان کام نہ تھا۔ لیکن در صاحب کی سر پرستی میں اردو زبان کا یہ بامقصد اور بامعنی پروگرام 22 فروری 1959ء کو شروع ہوا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے خدوخال ابھرنے شروع ہوئے۔(5)

پریم ناتھ در ڈائریکٹریٹ میں اردو پروگراموں کے بھی سربراہ تھے۔ ان کی ہی بدولت آل انڈیا ریڈیو کے دوسرے اسٹیشنوں پر بھی ''اردو مجلس'' جیسے پروگرام شروع کیے گئے۔ پریم ناتھ در نے ریڈیو کشمیر سری نگر میں بھی لوگوں کو اپنی مرضی سے ریڈیو پروگراموں کے لیے چنا۔ شبہ کرشن بھان کو پریم ناتھ در نے ریڈیو کشمیر سری نگر کے پروگرام زراعت میں نوکری دلوانے کا کام کیا۔ اس کے علاوہ سوم ناتھ سادھو صاحب کے والد پریم ناتھ در کے کشمیری دوست تھے۔ اور وہ سری نگر میں ہی رہتے تھے۔ پریم ناتھ در نے سوم ناتھ سادھو کو ریڈیو کشمیر کے پروگرام ''زون ڈب'' میں رسیور کے عہدے پر فائز کروایا اور موہن لال کا نام ہندوستانی موسیقی کار، ٹیم میں شامل کرواکے انھیں روس بھیجنے میں مدد کی۔ ساتھ ہی مہندر کول کو بی۔ بی۔ سی۔ (B.B.C) اردو نیوز سروس میں بھیجا۔

پریم ناتھ در اور ادبی نشست:

پریم ناتھ در 1945ء سے قبل کشمیر کے ممتاز اردو افسانہ نگار ''پریم ناتھ پردیسی'' کے مکان میں ہونے والی ادبی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب در نے ابھی افسانہ نگاری کی شروعات نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ 1945ء میں لکھا۔

کلچرل کانفرنس:

1975-76ء میں پریم ناتھ در ایک برس تک کشمیر میں ملازم تھے یعنی شیخ محمد عبداللہ کے مشیر برائے اطلاعات تھے۔ اس وقت انھوں نے اپنے آپ کو کلچرل کانفرنس سے بھی وابستہ کیا۔ کلچرل فرنٹ بعد میں کلچرل کانگریس میں تبدیل ہوئی۔ اس میں شاعر ادیب ودانشور شریک ہوتے تھے۔ ہفتے میں ایک روز شعر و ادب کی

نشست ہوا کرتی تھی۔ کلچرل کانگریس بنیادی طور پر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ نظریاتی طور پر وابستہ تھی اور ریاست کے ترقی پسند قلمکار اس کے پس پشت تھے۔ پریم ناتھ در کے حوالے سے برج پریمی لکھتے ہیں کہ:

> میں نے پریم ناتھ در کو صرف دو ر بار دیکھا۔ پہلی بار کہانی کار پریم ناتھ در کو ایک ادبی اجتماع سے کہانی پڑھتے ہوئے دیکھ کر لگا تھا ایک پہلوان اکھاڑے میں اتر آیا ہے اور اپنے حریفوں کو للکار رہا ہے۔ یہ اس صدی کے پانچویں دہے کی بات ہے۔ تب ترقی پسند تحریک کا بول بالا ہے۔ اس دور میں میں نے پریم ناتھ در کو ایک ایسی ہی نشست میں اپنی کہانی پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا میرے لیے ان کی حیثیت ایک عام افسانہ نگار کی تھی جو اتفاق سے کشمیری بھی تھا۔ اور اردو کے وسیلے سے لکھ رہا تھا۔ میں اردو کے کئی کشمیری افسانہ نگاروں کو سن چکا تھا۔ اختر محی الدین، علی محمد لون، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان اور سب سے بڑھ کر پریم ناتھ پردیسی کو پردیسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اختر محی الدین اور ان کے ہم عصر تیج بہادر بھان کے علاوہ سب کشمیری کی طرف آ گئے تھے۔ وہ لفظوں کی ادائیگی کے ساتھ آوازوں کے زیر و بم کا بھی خیال رکھے ہوئے تھے۔ کہانی کشمیری ماحول سے متعلق تھی۔ اس میں کشمیر کے معاشرے کی بسورتی ہوئی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ اس میں سے ابھرنے والے انسان کے بے کل باطن اور اس کے داخلی ردعمل کی داستان کھل کر سامنے آئی تھی۔ در نے مدھم لہجے میں گہرے درد کا احساس دلایا تھا۔ اس زمانے میں کرشن چندر کے اسلوب کا رسیا تھا۔ اس لیے در کے اسلوب سے بالکل متاثر نہ ہوا۔ مجھے الفاظ کی وہ نفاست، زبان کا وہ لوچ، حسن کا وہ سیلاب نہیں ملا جو کرشن چندر کا امتیاز تھا۔ بہر حال محفل ختم ہونے سے پیشتر در نے چند سوالوں کے جواب اعتماد سے دیئے۔ میں جیسے عرض کر چکا ہوں کہ در کے اسلوب بیان سے متاثر نہیں ہوا۔ البتہ ان کی کہانی میں ایک نئے آہنگ کا احساس ضرور ہوا۔ اور روایتوں اور رسوم و قیود کی زنجیروں کو توڑنے والے ایک فن کار کی تصویر ذہن پر چسپاں ہو گئی۔ (6)

ادبی صورتحال:

ریاست جموں وکشمیر ہمیشہ سے علم وادب، تہذیب وتمدن کا مرکز رہی۔ ویدک دور سے ہی یہاں پر ادب کے ابتدائی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> یوں تو ریاست جموں وکشمیر زمانہ قدیم سے فن خطاطی کا مرکز رہی ہے۔ ویدک عہد میں بھوج پتر پر لکھنے کا رواج عام تھا۔ کنشک کے زمانے میں تیسری بودھ عالموں کی بین الاقوامی کانفرنس کشمیر میں ہی منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی کاروائی تانبے کے بڑے بڑے تختوں پر کندہ کروائی گئی۔ اوران تختوں کو وہیں کسی نامعلوم جگہ پر دفن کیا گیا۔(7)

کشمیر میں خطاطی کی ابتدا کے حوالے سے ڈاکٹر پریمی رومانی لکھتے ہیں کہ:

> چھٹی صدی عیسوی میں ظہوراسلام کے بعد اسلامی خطاطی کی داغ بیل پڑی۔ کشمیر میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کے وارد ہونے سے فن خطاطی کے بعض ماہرین بھی کشمیر پہنچ گئے۔ اور پھر سلطان زین العابدین، شاہ میر عہد مغل اور افغانوں کے دور سے گزر کر خطاطی مختلف مرحلے طے کرتی رہی۔(8)

کشمیر میں جب مغلیہ حکومت تھی تو فارسی یہاں کی علمی وادبی زبان تھی لیکن بعد میں جب افغانوں اور سکھوں کا دور آیا تو فارسی غائب ہونے لگی۔ سکھوں کے بعد ریاست کا نظام جب ڈوگرہ حکمرانوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے فارسی کی جگہ اردو کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ادب کی ترقی کے لیے بہت سے اقدامات اٹھائے جن میں بدیا بلاس پریس اور بدیا بلاس کا اجرا خاص طور پر اہم ہیں۔ انھوں نے جموں میں ایک دارالترجمہ کا قیام بھی عمل میں لایا۔ اس ادارے نے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع کیں اور بہت سے مسودوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے سبب ریاست میں اردو نثر کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

پریم ناتھ در کے عہد میں اردو ادب کے مختلف اصناف میں بہت ترقی ہوئی۔ آزادی سے قبل اور

آزادی کے بعد بہت سے ایسے ادبی ادارے اور انجمنیں وجود میں آئے جنھوں نے نہ صرف سرکاری زبان اردو کا وجود برقرار رکھا بلکہ اس زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کیا جس کے باعث اردو زبان عوام میں مقبول سے مقبول تر ہوتی گئی۔ان تنظیموں نے ادب کے فروغ میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔

انجمن مفرح القلوب: اس انجمن کو ریاست کی پہلی غیر سرکاری ادبی انجمن ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس انجمن کا قیام پریم ناتھ در کے عہد سے پہلے ہوا۔یہ انجمن 1900ء کے آس پاس وجود میں آئی۔اس انجمن کو منشی سراج الدین احمد خان نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے قائم کیا تھا۔

1941ء تک یہ انجمن اپنے پروگرام منعقد کرتی رہی اور 1941ء میں منشی سراج الدین احمد کی وفات کے ساتھ ہی یہ انجمن بھی بند ہوگئی۔اس انجمن کے پروگراموں میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب حصہ لیا کرتے تھے۔اس حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی رقم طراز ہیں کہ:

> ریاست کے علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمارے ذہن میں ایک ایسی علمی و ادبی انجمن کا نام آتا ہے جو اس صدی کے اوائل میں ''مفرح القلوب'' کے نام سے میر منشی سراج الدین احمد خان نے اپنے چند ہم عصروں کے اشتراک سے قائم کی اور ریاست میں باضابطہ طور پر ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ان ادبی سرگرمیوں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔اس انجمن کی تقاریب میں بعض سرکردہ علمی و ادبی شخصیات حصہ لیتی رہیں جن میں شیخ عبدالقادر اور علامہ اقبال جیسے سربرآوردہ ادیب بھی شامل ہوتے تھے۔(9)

1915ء میں انجمن ''معین الاسلام'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے بانی مولانا اندرابی تھے جس کے تحت اکثر ادبی مجالس ہوتی تھیں۔بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے پاس 1928ء میں مولانا مبارک شاہ گیلانی نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر انجمن ''اخوان الصفا'' کی بنیاد ڈالی۔1936ء میں جب پورے ملک میں ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم ہوئی تو کشمیر میں اس کی بنیاد پریم ناتھ پردیسی نے 1942ء میں رکھی۔اس کے پروگراموں کو آگے بڑھانے میں رامانند ساگر کا بھی ہاتھ رہا۔اس انجمن نے کشمیر میں اردو شعر و ادب کی

فضا سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

1947ء میں قبائلی حملے کے دوران ریاستی ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں نے کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک ثقافتی اور ادبی انجمن قائم کی۔ ڈاکٹر برج پریمی اس انجمن کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> کلچرل فرنٹ میں ادب سے زیادہ سیاسی موضوع پر کام ہوتا تھا۔ اس انجمن کا رول تاریخی بھی رہا اور تعمیری بھی۔ اس کے تین شعبہ تھے۔ بعد میں اس ہی فرنٹ کا نام بدل کر کلچرل کانگریس رکھا گیا۔(10)

1947ء کے بعد ریاست میں علمی و ادبی اداروں کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ پرائیویٹ اور سرکاری سطح پر بہت سے ادارے قائم کیے گئے۔ جس سے اردو شعر و ادب کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملا۔ جن میں بزم ادب اردو، بزم ادب جموں، بزم ادب کشتواڑ اور انجمن ادب جموں وکشمیر یہ انجمن 1967ء میں قائم کی گئی تھی، ان انجمنوں میں مختلف زبانوں کے شاعر شامل ہوتے تھے مگر ان کی کاروائی اردو زبان میں ہوتی تھی۔ اس ہی طرح ''حلقۂ فکر وفن جموں'' کے نام سے ایک اور بزم 1973ء میں قائم کی گئی۔ یہ بزم شام سندر ہر اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی کاوشوں سے وجود میں آئی، جس میں زیادہ تر نئے لکھنے والے شاعر وادیب شامل ہوئے۔ حلقۂ فکر وفن کے زیر اہتمام 1975ء میں آل جموں وکشمیر اردو رائٹرز کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ ان کے علاوہ اگر اس عہد میں سرکاری اداروں اور انجمنوں کی بات کی جائے تو 1947ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں بہت سے ایسے سرکاری ادارے اور انجمنیں وجود میں آئے جنھوں نے اردو زبان وادب کو فروغ دیا۔ ریاست میں جن سرکاری اداروں اور انجمنوں نے 1947ء کے بعد اردو زبان وادب کو فروغ دیا ان میں:

(1) جموں وکشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز؛

(2) ریڈیو کشمیر سری نگر، ریڈیو کشمیر جموں؛

(3) شعبہ اردو، کشمیر یونیورسیٹی

(4) شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، کے نام قابل ذکر ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں کلچرل اکیڈمی کا قیام 1958ء میں اس وقت کے صدر ریاست یوراج کرن سنگھ کے ہاتھوں سے ہوا۔ کلچرل اکیڈمی کے قیام کے حوالے سے محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں کہ:

> ہماری دانشمندی اور روشن خیال قیادت نے جب آج سے چالیس برس پہلے یعنی 1949ء میں مستقبل کی ریاست کا خاکہ ''نیا کشمیر'' کی شہرہ آفاق دستاویز میں کھینچا تو اس میں ایک کلچرل اکادمی کا قیام بھی شامل تھا۔ چنانچہ جب 1957ء میں ریاست کی دستور ساز اسمبلی نے ریاست کا آئین منظور کیا تو اس میں سرکار کے لیے کلچرل اکادمی کے قیام کو ایک آئینی لازمہ بنایا گیا۔ اور کلچرل اکادمی کے قیام کا اعلان صدر ریاست یوراج کرن سنگھ کے اعلان 4/SR/58 مورخہ 7 جولائی 1958ء کو کیا صدر ریاست نے ہی اکادمی کھولنے کی رسم انجام دی۔ کلچرل اکادمی کے پہلے دفتر کا افتتاح اکادمی کے بانی صدر بخشی غلام محمد مرحوم نے 24 اکتوبر 1958ء کو کیا اس وقت اکادمی کا پہلا بجٹ پچاس ہزار پر مشتمل تھا۔(11)

ریاست میں ادب کے فروغ میں کلچرل اکادمی کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ کلچرل اکادمی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشاعرے، سیمینار اور ادبی محفلیں بھی منعقد کرتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کلچرل اکادمی اردو میں دو رسالے ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب'' بھی شائع کرتی آ رہی ہے۔

ریڈیو کشمیر سری نگر اور ریڈیو کشمیر جموں نے بھی اپنے پروگراموں کے ذریعہ ادب کے فروغ میں کافی اضافہ کیا اور شعبہ اردو جموں اور شعبہ اردو کشمیر بھی اردو ادب کو فروغ میں اپنی ذمہ داریاں نبھاتے آ رہے ہیں۔ پریم ناتھ در کے عہد میں صحافت کی بات کی جائے تو اسی دوران اردو صحافت کا عروج ہوا۔ ریاست میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور اور دوسری جگہوں سے ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ 1924ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار جموں سے جاری کیا۔ اس اخبار نے ریاست میں اردو نثر کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کی۔ یہ اخبار ''رنبیر'' کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ 18 مارچ 1924ء کو مہاراجہ کی کونسل نے اسے منظوری دی تھی۔ جموں وکشمیر کی صحافت

کے حوالے سے نندلال واتل لکھتے ہیں کہ:

> جموں و کشمیر میں صحافت کی تاریخ اس صدی کی تیسری دہائی سے شروع ہوتی ہے۔ 1931ء میں ریاست کی شخصی حکومت کے خلاف عوام کی تحریک نے انقلابی رخ اختیار کرلیا۔ ایک طویل مدت تک کچلے جانے کے بعد عوام اس سال پہلی مرتبہ احتجاج اور ایجی ٹیشن کی راہ پر گامزن ہوئے۔ بہت سے لوگ قید ہوئے اور کئی ایک نے جام شہادت نوش کیا۔ عوام کی اس بیداری سے شخصی حکومت کے ایوانوں میں ایک زلزلہ آیا۔ 12 نومبر 1931ء کو مہاراجہ نے اس وقت کی حکومت ہند کے خارجی اور سیاسی محکمہ کے ایک افسر مسٹر بی۔ جے گلینس کی صدارت میں ایک کمیشن کا تقرر عمل میں لایا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ اپریل 1933ء میں پیش کی۔ مہاراجہ کی حکومت نے اس کی اکثر سفارشیں منظور کیں۔ اس کمیشن کی سفارش پر ریاست کے عوام کو انجمن سازی کی اجازت دی گئی اور پریس اور پلیٹ فارم کو آزاد قرار دیا گیا۔ اور اس طرح ریاست میں صحافت کی تاریخ کا آغاز ہوا۔(12)

ریاست میں جب پریس کو آزادی ملی تو یہاں سیاسی انجمنیں بھی وجود میں آئیں اور اخبارات کی اشاعت بھی شروع ہوئی۔ کشمیر میں پہلا اخبار ''وتستا'' نام سے شائع ہوا جو 1933ء میں پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں جاری ہوا۔ ''وتستا'' کے بعد جو اخبار جاری ہوئے ان میں ''روزانہ مارتنڈ'' اور دوسرا ''صداقت''، ''مارتنڈ'' اخبار کو کشمیری پنڈتوں نے جاری کیا۔ اور ''صداقت'' اخبار کو مدیر عبدالرحیم نے جاری کیا۔ اسی سال یعنی 1935ء میں ''ہمدرد'' نام کا اخبار جاری ہوا، جس کو جاری کرنے میں شیخ محمد عبداللہ کا بڑا ہاتھ رہا۔ اسی دوران نیشنل کانفرنس نے ''خدمت'' نام کا اخبار جاری کیا۔ 1947ء میں جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو اس کے اثرات کشمیر پر بھی پڑے۔ کیونکہ ان ہی دنوں پاکستان نے جموں و کشمیر پر حملہ کیا، جس کے نتیجہ میں شخصی نظام کا خاتمہ ہوا اور عوام کی منتخب کی ہوئی حکومت قائم ہوئی۔ لیکن پاکستان کے اس حملے کی وجہ سے ریاست میں بہت سے اخبار بند ہو گئے۔ اسی دوران جموں سے شری نرسنگھ داس نرگس نے اپنا ہفتہ وار اخبار ''چاند'' کو جاری کیا بعد میں اس کو

روزانہ کر دیا گیا۔ نندلال واتل اس دور کے اخبارات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> 1947ء اور 1964ء کے دوران اخبارات کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس دوران ریاست کے محکمہ اطلاعات نے انگریزی اور ہندی میں رسالے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور رسالے کا نام ''تھاتیہ'' تھا جس کی ادارت شمیم احمد شمیم کے ہاتھ میں تھی جو اب پارلیمنٹ کے ممبر ہیں کچھ وقت جاری رہنے کے بعد یہ تینوں رسالے بند ہو گئے۔(13)

بعد میں جب غلام محمد صادق کی حکومت آئی تو ریاست میں اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بیسویں صدی میں ریاست کے قلمکاروں نے افسانہ، ناول، ڈراما، غزل اور دیگر اصناف کی طرف بھی اپنا رجحان کیا اور اپنے قلم کا جوہر دکھایا اور ہر شعبے میں اپنی خدمات انجام دیں۔

افسانہ کی بات کریں تو کشمیر کے اردو افسانہ کے مزاج کا بنیادی رجحان کشمیریت رہا۔ ملک کے تقسیم ہونے سے پہلے اور بعد کے افسانوں میں دکھ، درد اور جبر کی کہانیاں ملتی ہیں۔

1947ء سے پہلے جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کا مقصد شخصی راج کے خلاف عوام کو بیدار کرنا اور ریاست کے لوگوں کو جاگیرداروں سے نجات دلوانا تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے غربت، بھوک، افلاس، پسماندگی، معاشی و اقتصادی، بدحالی، طبقاتی کشمکش کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور حالات و واقعات کو مقامی رنگ دیا، مقامی کرداروں کو پیدا کیا۔ 1947ء کے بعد کے افسانوں میں بھی کشمیریت برقرار رہی اور ان میں بھی کشمیر کے پرانے دکھ درد کے ساتھ کشمیر کی تقسیم، ہجرت، قبائلی حملہ، رومانیت، نفسیاتی حقیقت پسندی، شخصی حکومت کا خاتمہ، آزاد عوامی حکومت کا قیام جیسے موضوعات پر لکھا گیا۔ جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو ریاست کشمیر بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ کشمیر کے تقسیم ہونے کی وجہ سے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے خیالات بھی تقسیم ہو گئے۔ پھر بھی ان افسانہ نگاروں نے کشمیر کی سماجی اور معاشی صورتحال کی اچھی عکاسی کی۔ ڈاکٹر برج پریمی ریاست میں افسانہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش محمد دین فوق اور چراغ حسن حسرت کی تحریروں میں ملتے ہیں لیکن پریم ناتھ پردیسی نے مکمل افسانہ کی بنیاد ڈالی۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی تصویر کشی کی، بھوک اور افلاس کا احساس دلایا۔ پردیسی نے اپنے افسانوں میں ریاست کی صحیح عکاسی کر کے کشمیر کا اصل رنگ وروپ پیش کیا۔ریاست میں اس سے پہلے اردو کا مختصر افسانہ اس قدر منجھی ہوئی صورت میں نظر نہیں آتا۔ پردیس نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔(14)

پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے کشمیر کی حقیقی منظر کشی کی۔ پردیسی کے افسانے ''اَن کوٹ''، ''اگلے سال'' اور ''دیوتا'' کشمیر کی حقیقی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔کشمیر کے حالات پر پردیسی لکھتے ہیں کہ:

> کشمیر کا ہر باشندہ بذات خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، شخصی راج ہے۔(15)

پریم ناتھ پردیسی کے علاوہ اس عہد میں جن افسانہ نگاروں نے اپنا فن دکھایا ان میں خود پریم ناتھ در، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس، گنگا دھر دیہاتی، کشمیری لال ذاکر، پشکر ناتھ، برج پریمی، نور شاہ، ٹھاکر پونچھی، کلدیپ رعنا اور حامدی کشمیری کے نام اہم ہیں۔رامانند ساگر نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی اچھے سے عکاسی کی۔انھوں نے ایک ناول ''اور انسان مر گیا'' کے عنوان سے لکھا جو فسادات پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ ان کے بیشتر افسانے ہیں جو کشمیر کے سماجی اقدار، جاگیردارانہ نظام اور وہاں کی غریبی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ساگر کے افسانوں میں کشمیر کے حالات مناظر وہاں کے رہن سہن اور لوک گیتوں کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ساگر نے کشمیر کے مزدوروں کے مسائل کی جس کامیابی کے ساتھ نشان دہی کی ہے وہ لاجواب ہے۔کشمیر میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور کوئی ذریعہ معاش نہیں اگر ذریعہ معاش ہے بھی تو وہاں رشوت، سود خوری اور استحصال کا بازار گرم ہے

کہ عام انسان اور مزدور طبقہ ان تک رسائی نہیں کر پاتا۔ مزدوروں کے متعلق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> سامان اترواتے ہوئے اگر صاحب کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی ادھر پھر جاتی تو ایک ساتھ کئی آوازیں گونج اٹھتیں صاحب___ صاحب___ صاحب___ یہ اچھا والا___ ہم بوجھ کا کچھ بھی نہیں لے گا___ بس ہمارا گھوڑا دور سے یوں دکھائی دیتا گویا مفلس ہندوستان کی روح چند ٹکوں کے لیے چیختی اور چلاتی اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے تار تار ہو گئے۔ فرنوں___ میل بھرے بالوں، کچیلے جسموں اور بوائی سے زخمی ہاتھوں اور پیروں والی آتما___ اس کی آنکھوں میں احساس برتری کی ایک چمک پیدا ہوتی اور وہ سامان کھولنے والے مزدور کی پیٹھ سے اپنا بیٹ چھو کر کہتا___ جلدی مانگتا___ ڈیم یو___ ابھی کھولتا صاحب___ اور مزدور کی پھٹی ہوئی کالی انگلیاں مضبوط اور موٹے سفید رسے کی گانٹھیں کھولنے میں زیادہ تیزی سے کام لیتی۔(16)

راما نند ساگر نے کشمیری مزدوروں کی لاچاری اور بیچارگی کی جس طرح تصویر کشی کی ہے۔ وہ قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب نے بھی اس عہد کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔

ان کے افسانوں میں ''پکے پکے آم'' اور ''پھوڑے والی ٹانگ'' اور ''یا خدا'' اہم ہیں جن میں کشمیریوں کی مظلومیت کی داستان بیان کی ہے۔ 1947ء کے دوران ریاست جموں و کشمیر میں جو کچھ ہوا اس کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس عہد کے ایک اور افسانہ نگار نرسنگھ داس نرگس نے بھی محنت کش عوام پر زمینداروں اور جاگیرداروں کے مظالم کے حوالے سے کئی افسانے لکھے۔ ان کا ایک افسانہ ''اچھی عید آئی'' ایک ایسا افسانہ ہے جو آزادی سے قبل شخصی راج کے سماجی نظام پر ایک زبردست طنز ہے۔ اس افسانہ کے ایک اقتباس میں یوں لکھتے ہیں کہ:

> قبرستان میں ایک قبر کھودی جارہی تھی سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ تحصیل دار نے غلاماں کے پیٹ میں ایسی لات جمائی کہ غریب کا بیٹا موت کے گھاٹ اتر گیا

> اور پھر یہ راز بھی پوشیدہ نہ رہا کہ کس طرح تحصیل دار کو پتہ چل گیا تھا کہ اس گاؤں میں غلاماں کی بہن سب سے خوبصورت لڑکی ہے اور جب بھائی سے بہن کی پیش کش کے لیے کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور اسی انکار کی وجہ سے اسے موت کے منھ میں جانا پڑا۔(17)

کشمیر کے اسی درد کو پشکر ناتھ نے بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی ثقافت اور سماجی زندگی کی عکاسی کی ہے۔''درد کا مارا'' ان کا ایک شاہکار افسانہ ہے،جس کا مرکزی کردار کشمیر کا مہمان نواز انسان دوست تاجر''صمد جوکی'' ہے جس کو جنوبی ہند کی ایک لڑکی سمجھ نہیں پاتی۔ یہ افسانہ ایک طرح کی سیاسی معنویت رکھتا ہے اور اس میں کشمیر کا درد بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کشمیر کا یہی درد گنگا دھر دیہاتی کی کہانیوں میں ملتا ہے۔انھوں نے کشمیر کی سیاسی،سماجی، معاشی و اقتصادی بدحالی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔اسی طرح اس عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی کشمیریت کو مدنظر رکھ کر لکھا جن میں کلدیپ رعنا، ٹھاکر پونچھی، حامدی کشمیری اور نور شاہ کا نام آتا ہے۔ان افسانہ نگاروں نے کشمیر کے موضوعات کو اجاگر کیا اور اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو اپنی کہانیوں کے ذریعہ بیان کیا۔ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں نے وقت بے وقت ریاست کی سماجی، سیاسی، معاشی و اقتصادی صورتحال کو وقت بے وقت اپنی کہانیوں کے ذریعہ پیش کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار آتے گئے اور ریاست کے نئے نئے موضوع کے حوالے سے لکھتے گئے۔ ویسے تو اس عہد میں کشمیر کے پس منظر میں بہت سے افسانہ نگاروں نے لکھا جن میں برصغیر کے افسانہ نگاروں کا نام بھی آتا ہے لیکن یہاں پر میں اس عہد کے دو افسانہ نگاروں کا نام لینا چاہتا ہوں جنھوں نے کشمیر کے متعلق لکھا اور اپنی کہانیوں میں کشمیر کے مسائل کو جگہ دی۔ یہ افسانہ نگار تھے کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو،منٹو کی پیدائش حالانکہ دوسری ریاست میں ہوئی لیکن ان کے باپ دادا کا تعلق کشمیر سے تھا۔کرشن چندر کی پیدائش بھی ریاست جموں وکشمیر سے باہر ہوئی لیکن ان کا بچپن کشمیر کی وادیوں میں ہی گزرا۔کرشن چندر نے کشمیر کی خوبصورتی پر بھی افسانے لکھے۔لیکن ساتھ ہی کشمیر کی عوام کی خستہ حالی کو بھی نہ بھولے۔کشمیر کی جھلک منٹو کے

افسانوں میں کہیں کہیں اور کرشن چندر کے افسانوں میں اکثر نظر آتی ہے۔منٹو نے جو افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے ان میں ''ٹیٹوال کا کتا'' اور'' آخری سلیوٹ'' اہم ہیں۔''ٹیٹوال'' کشمیر کی وادی نیلم کا علاقہ ہے جہاں 1947ء کے جنگ کے بعد سیز فائر لاین گزرتی ہے۔اس سیز فائز لائن کے ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف ہندوستان کی فوج ہے۔منٹو کا افسانہ''ٹیٹوال کا کتا'' اسی صورتحال پر لکھا گیا ہے۔'' آخری سلیوٹ'' میں کشمیر کی سرحد اور فوجیوں کے مورچے نظر آتے ہیں اور کرشن چندر کے افسانوں میں کشمیر کی منظر کشی، دیہاتی زندگی اور رومانی کیفیت کا ملا جلا سنگم دیکھنے کو ملتا ہے۔کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ان کے افسانوں میں ''جنت اور جہنم''، ''بندوالی''، ''کفارہ''، ''کشمیر کو سلام''، ''جیل سے پہلے'' اور ''جیل کے بعد'' اور ''چاند کی رات'' جیسے کئی افسانے شامل ہیں۔

ناول:

اگر ناول کی بات کریں تو ریاست جموں وکشمیر میں پریم ناتھ در کے عہد میں ہی ناول پروان چڑھا اور یہاں 1947ء کے بعد ہی ناول باقاعدہ طور پر منظر عام پر آیا۔اس دور کے ناولوں میں بھی جموں وکشمیر کے سیاسی،سماجی،معاشرتی اور تہذیبی رنگوں کی جھلک ملتی ہے۔بیسویں صدی میں سب سے پہلے ناول کے ابتدائی نقوش پنڈت سالک رام اور مولوی منشی محمد فوق کے قصوں میں ملتے ہیں۔ریاست میں ناول کے حوالے سے برج پریمی لکھتے ہیں کہ:

> انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگرام سالک اور منشی مولوی محمد الدین فوق نے کی۔سالگرام سالک نے داستان'' جگت روپ'' اور تحفہ سالک تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی اگرچہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔لیکن ان میں قصے کی مہک ہے''داستان جگت روپ'' ناول سے زیادہ ایک داستان ہے۔اس سے بہتر کوشش مولوی محمد الدین فوق کے یہاں ملتی ہے۔(18)

فوق اور سالگرام سالک کے بعد موہن لال اور وشوناتھ ورمانے ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا لیکن ریاست میں ناول نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، رامانند ساگر، ملک راج آنند اور کشمیری لال ذاکر کے قدم رکھنے کے بعد مزید پروان چڑھا۔ کشمیری لال ذاکر ''سیندور کی راکھ'' لکھ کر ناول کی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس ناول میں کشمیر کی سماجی زندگی کی داستان بیان کی ہے۔ ایسے ہی نرسنگھ داس نرگس نے ''پاربتی'' اور ''نرملا'' جیسے ناول لکھے۔ لیکن اس عہد کا مقبول ترین ناول رامانند ساگر کا ''اور انسان مرگیا'' ہے۔

فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا یہ ناول بہت مقبول ہوا اور پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا۔ اس ناول کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ ٹھاکر پونچھی نے بھی اس عہد میں ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں ''وادیاں اور ویرانہ''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' اور ''پیاسے'' جیسے ناول لکھے۔ ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں دیہاتی وشہری زندگی کے واقعات ملتے ہیں۔ 1947ء سے پہلے لکھنے والے ناول نگاروں کا انداز روایتی تھا لیکن نئی نسل کے ناول نگاروں نے نئے موضوعات کو اپنے ناولوں میں شامل کیا۔ 1960ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں ناول کی طرف کافی توجہ دی گئی اس دوران جو ناول نگار سامنے آئے ان میں تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کشمیری اور نور شاہ جیسے ناول نگار سامنے آئے۔ تیج بہادر بھان نے اپنے ناول ''سیلاب اور قطرے'' میں کشمیر کے معاشرے کی درد بھری زندگی اور ان کی غریبی کو موضوع بنایا ہے۔ عبدالقادر سروری اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> یہ ناول ایک اچھا حقیقت پسندانہ بیانیہ اور کسی حد تک ایک نفسیاتی مطالعہ اور کشمیر کی فضا کے پس منظر میں ایک نچلے طبقے کی زندگی کے واقعات کے بیٹھ بٹھار کا دلچسپ اور معنی خیز نقشہ بن گیا ہے۔(19)

اس دور میں حامدی کاشمیری نے بھی ناول لکھے۔ حامدی کاشمیری اپنی شاعری اور تنقید کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے فکشن میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ حامدی نے ''پرچھائیوں کا شہر''، ''بہاروں میں شعلے''، ''بلندیوں کے خواب''، ''پگھلتے خواب'' اور ''اجنبی راستے'' جیسے ناول لکھے۔ ان ناولوں میں کشمیر کی

زندگی اور یہاں کے سیاسی وسماجی ماحول کو پیش کیا ہے۔ ریاست میں جب نئے ناول نگار سامنے آئے تو ان کے لکھنے کا انداز مختلف تھا۔ ان ناول نگاروں نے کہیں رومان کی دھند میں لپٹی فضا کو پیش کیا اور کہیں سماجی نابرابری کے مسائل کو ابھارا۔ ایسے موضوعات پر جو ناول لکھے گئے ان میں ''یہ بستی یہ لوگ''، ''درد کا دریا'' یہ دونوں ناول عمر مجید نے لکھے۔ اس کے علاوہ بھوشن لعل بھوشن کا ناول ''صرف پانچ ہزار'' رشید پروین کے دو ناول ''دل اور دریا'' اور ''سیاسی پائل'' لکھے گئے ان ناولوں میں کشمیر کے دکھ، درد، مظلومیت، جبر اور استحصال کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر اس عہد میں ڈرامے کی صورتحال کا جائزہ لیں تو ریاست جموں وکشمیر میں انیسویں صدی کے آخر میں پہاڑی ڈرامے کے نقوش ابھرنے لگے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کلچرل تہذیب تمدن اور ادب کے شوقین تھے۔ ان کا عہد علم وادب کا عہد تھا۔ انھوں نے ریاست میں ایک لائبریری، ایک سنسکرت کالج اور ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ اس طرح عوام نئے نئے فنون سے آگاہ ہونے لگے۔ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ تخت نشیں ہوئے وہ بھی علم وادب کے شوقین تھے۔ ان کے عہد میں اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ اسی عہد میں مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ لیکن اس فن کا آغاز صحیح معنی میں اس وقت ہوا جب ریاست کے بعض نوجوان ملازمت یا تجارت کے لیے ریاست سے باہر جاتے تھے اور فرصت کے وقت ہندوستانی تھیٹر ڈراما دیکھتے تھے جس سے انھیں بھی اسٹیج سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ واپس آکر وہ بھی ریاست میں ڈراما کھیلنے کی کوششوں میں مصروف رہنے لگے۔ ہندوستان میں اس وقت بیتاب بنارسی، مہدی حسن، احسن لکھنوی، طالب بنارسی، رونق بنارسی اور آغا حشر کاشمیری جیسے فنکار چھائے ہوئے تھے۔ ان کے ڈرامے دیکھ کر ریاست میں بھی اسی قسم کے ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ اس حوالے سے پریمی رومانی لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان کے ان بڑے بڑے ڈراما نگاروں کے ڈرامے دیکھ کر ریاست کے فنکاروں میں بھی حوصلہ پیدا ہوگیا۔ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہوگئے۔ اردو کے معروف ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری نے کئی سبق آموز ڈرامے لکھے جن کو ریاست میں جگہ جگہ کھیلا گیا۔ اس طرح سے ڈراما نگاری کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اردو چونکہ یہاں کی سرکاری زبان تھی۔ اس لیے دوسری کئی زبانوں کے معیاری ڈرامے اردو میں منتقل کیے گئے۔(20)

ریاست جموں وکشمیر میں ڈراما نگاری کو ترقی وفروغ دینے میں محمد عمر نورالٰہی کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' اردو ڈراما نگاری میں پہلی مستند کڑی تھی۔محمد نورالٰہی کے ساتھ ساتھ ماسٹر غلام حیدر نے بھی ڈرامے لکھے۔1933ء میں دینا ناتھ وارید نے ''رکمنی ہرن'' نام کا ایک ڈراما لکھا۔ریاست میں تھیٹر کے حوالے سے پریمی رومانی لکھتے ہیں کہ:

> ریاست کی تھیٹر تحریک کو تقویت دینے میں IPTA یعنی انڈین پیپلز تھیٹر کے رول کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا عوامی تھیٹر سے وابستہ قلمکاروں نے بلراج ساہنی کے کہنے پر IPTA کی ایک شاخ قائم کی۔یہ شاخ ریاست میں تھیٹر تحریک کو فروغ دینے میں کارآمد ثابت ہوئی۔(21)

کشمیر پر جب قبائلی حملہ ہوا اور پورے کشمیر میں لوٹ کھسوٹ ماردھاڑ اور قتل گری کا بازار گرم ہوا تو ان حالات کو قابو میں لانے کے لیے ریاست کے دانشور، ادیب، شاعر اور فنکار سامنے آئے۔انھوں نے ایک کمیٹی کلچرل فرنٹ کے نام سے بنائی۔اس کمیٹی کے تین شعبے تھے۔ادیبوں اور شاعروں کا شعبہ دوسرا مصوروں کا شعبہ تیسرا تھیٹر کا شعبہ۔کلچرل فرنٹ بعد میں آل اسٹیٹ کانگریس کے نام سے مشہور ہوا۔یہاں پر جو پہلا اردو ڈراما پیش کیا گیا وہ ''کشمیر یہ ہے'' کے نام سے تھا۔اس ڈرامے کے خالق پروفیسر محمود ہاشمی تھے۔اس کے علاوہ اور بھی ڈرامے اس فرنٹ نے پیش کیے جن میں پریم ناتھ پردیسی کے تین ڈرامے شامل ہیں۔''سوامی، سنگھرش'' اور ''ستم کی آخری رات'' ان ڈراموں میں کشمیر کے محنت کش عوام کے درد کے ساتھ ساتھ سماج کو لوٹنے والے درندوں کو بے نقاب کیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو ڈرامے میں کافی ترقی ہوئی۔بعض ڈراما نگاروں نے اس فن میں نئے تجربے کیئے اور اپنا ایک خاص مقام بنایا۔اسی دوران علی محمد لون نے بھی ''دیوانے کا خواب'' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا، جس میں انھوں نے کشمیر کی سماجی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کی۔اس کے علاوہ اس عہد میں جو ڈرامے منظر عام پر آئے ان میں ''انسان جیت گیا''، ''دھرتی اور ہم''، ''وادیاں اور ویرانے''، ''تمنا

کے قدم‘‘، ’’راستہ کانٹے اور نئی بستی‘‘، ’’پورن ماشی‘‘، ’’فطرت اور انتقام‘‘ اور ’’تخلیق کا گھاؤ‘‘ جیسے ڈرامے منظر عام پر آئے۔ اس عہد میں جن ڈراما نگاروں نے اپنی خدمات انجام دی ان میں ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، موہن یاور، حامدی کشمیری، پشکر ناتھ، قیصر قلندر، بنسی نردوش، شبنم قیوم اور آفاق احمد جیسے ڈراما نگاروں کے نام آتے ہیں۔ ریاست میں اردو ڈرامے کو فروغ دینے میں جموں وکشمیر کے ریڈیو اسٹیشنوں کا بھی ہاتھ رہا۔ ریڈیو جموں جس کا قیام 12 دسمبر 1947 کو ہوا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ریڈیو کشمیر جس کا قیام 1 جولائی 1948ء کو ہوا۔ ان دونوں اسٹیشنوں کے وجود میں آتے ہی ریاست کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوگئیں اور اردو ڈرامے بھی اکثر ان دونوں اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے۔

غزل:

پریم ناتھ در کے عہد میں جموں وکشمیر میں غزل کی صورتحال پر نظر ڈالیں تو اس عہد میں صنف غزل کا ظہور ہوتا ہے۔ جموں وکشمیر میں 1947ء تک اردو شاعری کا ایک خاص رنگ غالب رہا۔ جس میں ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وستم کی داستان اور غلامی سے چھٹکارا پانے کی خواہشوں سے مختلف رنگ وروپ میں شعری تخلیقات نے جگہ پائی اور کہیں کہیں محبت اور مذہبی موضوعات کا غلبہ رہا۔ آزادی سے قبل جن شعرا نے اپنے اردو وفارسی کلام کے ذریعے اردو کو جلا بخشی ان میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالک رام سالک نمایاں ہیں۔ خستہ کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا
صحبت پیر لازوال دنیا میں
آشناؤں کو ڈوبتے ہوئے دیکھا

پنڈت ہرگوپال کول خستہ کی شاعری میں اس دور کی بے چینی، بے بسی اور پریشانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس عہد کے شعرا میں ایک بڑے شاعر جن کا کشمیر کی ادبی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا وہ تھے منشی سراج الدین احمد خاں۔ انھوں نے ریزیڈینسی میں ایک انجمن مفرح القلوب کے نام سے قائم کی جہاں کئی ایسے منشی تھے جو شعرو

شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

محمد دین فوق نے بھی شاعری میں اپنی خدمات انجام دی۔محمد دین فوق صحافی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے علاوہ میرزا غلام احمد مہجور بھی کشمیر کے بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے اس عہد کی ترجمانی کی۔ان کی شاعری کے متعلق عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> مہجور اردو میں قدیم انداز کی غزل کہتے تھے کچھ نظمیں اور ایک آدھ قصیدہ بھی ان کی یادگار ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں سماجی پہلوؤں پر اچھے سے نظر ثانی کی۔مہجور کی شعری دلچسپیاں بیس پچیس برس تک جاری رہیں۔(22)

بیسویں صدی کے آغاز میں شعرائے جموں وکشمیر کی ایک نسل وجود میں آئی جو روایت پسندی کے ساتھ باغیانہ پن بھی رکھتی تھی۔ان شعرا نے اپنے سے قبل اساتذہ سے فن تربیت حاصل کی۔ بالخصوص پنڈت ہرگوپال کول خستؔہ، سالکؔ، فوقؔ اور مہجورؔ جیسے شعرا کی صحبت حاصل کی۔اس عہد میں جموں وکشمیر کے نوجوانوں میں نئے ادبی ذوق کو ترقی دینے میں جن شخصیتوں کا ہاتھ رہا ان میں ڈاکٹر محمد تاثیر کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاقیات اور تصوف کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حضور یاد میں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
جناب شیخ وضو کے لیے ہی سہی لیکن
کسی بہانے لب جو نکل ہی آتے ہیں

پنڈت نند لال بھی اسی زمانے کے لکھنے والوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کا زیادہ تر کلام اردو میں ہی ہے۔اردو میں انھوں نے قومی غزلیں اور اخلاقی نظمیں کہی ہیں۔

1947ء کے بعد کا دور سیاسی جدوجہد اور کشمکش کا دور ہے۔اس دور میں سماجی اور معاشی تعمیر کی طرف توجہ دی جانے لگی۔آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں شعرا کی ایک لمبی فہرست سامنے آتی ہے جو بنا کسی روک ٹوک کے اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کو شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ان میں رسا جاودانی، غلام رسول

نازکی، غلام مصطفیٰ عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، کامگار کشتواڑی، تنہا انصاری، محمد امین کامل، عبدالرحمان راہی، عرش صہبائی اور حامدی کاشمیری جیسے شعرا شامل ہیں۔

رسا جاودانی کا شمار اس عہد کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے۔ ''لالہ صحرا'' کے نام سے 1948ء میں ان کا پہلا مجموعہ چھپا اور دوسرا مجموعہ ''نظم ثریا'' کے نام سے 1962ء میں شائع ہوا۔

رسا جاودانی کی غزل گوئی پر پروفیسر عبدالقادر سروردی لکھتے ہیں کہ:

> غزل میں رسا کی طبعی مناسبت ہے اور اس صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں چھوٹی چھوٹی بحریں انھیں مرغوب ہیں۔ اور اپنے سادہ اظہار میں وہ میر تقی میر جیسا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانیت کم لیکن غور و فکر کی پرچھائیاں زیادہ نمایاں ہیں۔(23)

رسا جادوانی کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

جو اثر آگ پر ہے پانی کا
وہی دشمن پہ مہربانی کا
ایک جھونکا ہوا کا آ گزرا
کیا یہی عہد تھا جوانی کا

رسا جاودانی کی شاعری میں غور و فکر کی دبیز تہیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس غلام رسول نازکی غزلوں میں روایت کی پاسداری ملتی ہے۔ ان کی نظمیں فطرت کی منظر کشی تک محدود نہیں ہیں بلکہ نفسیاتی اور عصری مسائل کا منبع بھی ہیں۔

نازکی کی شاعری کے حوالے سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> نازکی کی شاعری ایک دکھی دل کی پکار ہے، ایک غم انگیز پکار نازکی کے یہاں غم زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے مثال کے طور پر ان کا ایک شعر۔

محبت زندگی اور زندگی غم ہوجاتی ہے
خوشی تحلیل ہوکر غم میں دردِ غم ہوجاتی ہے(24)

نازکی کے بعد اردو شاعری کا اہم نام تنہا انصاری کا ہے۔ان کی ابتدائی غزلوں میں رومانوی اور روایتی پاسداری ملتی ہے۔لیکن ان کی بعد کی غزلوں میں ان کا سماجی و تاریخی شعور واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا کے حوالے سدھارو سدھارو
مری آرزو کی رنگیں بہارو
نہ گھیرو تصور پہ شب خوں نہ مارو
مچلتے ہوئے آنچلوں کے کنارو
حماقت ہے اب ذکر رخسار و گیسو
طلسم محبت کے پروردگارو

تنہا انصاری کی طرح اس دور کے دوسرے شعرا کی ابتدائی غزلوں میں روایت پسندی رہی ہے۔عرش صہبائی کی غزلوں کو دیکھئے تو ان میں بھی ریاست کے حالات اور دوسرے مسائل ملتے ہیں جن میں وہ سماجی لوٹ کھسوٹ اور بدامنی جیسے موضوعات کو فنی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

نظر میں جو بھی ہے منظر غبار جیسا ہے
میرا معاشرہ مزار جیسا ہے
بدلتا رہتا ہے ہر اک چیز کا محور
جہاں جھوٹ بھی اب اعتبار جیسا ہے

حامدی کشمیری نے بھی شاعری میں اپنا فن دکھایا ہے۔حامدی کشمیری نے افسانہ، ناول، ڈراما اور تنقید و تحقیق کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی اہم رول ادا کیا۔انھوں نے اپنے تین مجموعوں ''عروس تمنا''، ''نایافت'' اور ''لاحرف'' کے ذریعہ غزل گو شعرا میں اپنی شناخت قائم کی۔

بیسویں صدی کے وسط یعنی آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں اردو غزل نے تیز رفتاری سے ترقی کی۔ اس دور کے شعرانے روایت پسندی کے ساتھ جدیدیت کو اپنا نظریہ بنایا۔

سیاسی صورتحال:

ریاست جموں وکشمیر سیاسی طور پر ہمیشہ سے گردش میں رہا ہے۔لیکن اصلی سیاسی بھونچال تب آیا جب دہلی میں مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی اور جس کا اثر ہندوستان کے تمام صوبوں پر پڑا۔کشمیر میں مغل دور کا آغاز 1587ء سے شروع ہوا جو 1752ء تک قائم رہا۔اس دوران کشمیر کی سماجی زندگی میں اتار چڑھاؤ چلتا رہا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد افغانوں نے موقع کی نزاکت دیکھ کر کشمیر پر حملہ کر دیا۔اور یہاں سے افغان دور کا آغاز ہوتا ہے۔افغان دور 1752ء سے شروع ہوتا ہے جو 1819ء تک قائم رہتا ہے۔1819ء میں سکھوں اور افغانوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں افغانوں کو شکست ملی اور کشمیر رنجیت سنگھ کی ریاست میں شامل ہو گیا۔لیکن 1846ء میں انگریزوں نے پنجاب پر حملہ کیا جس میں سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس وقت مہاراجہ گلاب سنگھ نے موقع کو غنیمت جان کر انگریزوں سے معاہدہ (Treaty of Amritsar) کیا اور ریاست جموں وکشمیر کو 75 لاکھ روپے میں خریدا یہاں سے ڈوگرہ راج کا آغاز ہوتا ہے۔ڈوگرہ راج میں ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات ایک الگ صورت میں ڈھلنے لگی۔مہاراجہ گلاب سنگھ کا زیادہ تر وقت ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف ہوا۔مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں فارسی درباری زبان تھی اور اردو عوام کی بول چال کی زبان۔گلاب سنگھ کا دور جہاں ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف ہوا وہاں اس کے برعکس رنبیر سنگھ کا دور ریاست میں علم وادب کو مستحکم کرنے میں صرف ہوا۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حوالے سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> رنبیر سنگھ کے زمانے میں سلطنت کے استحکام نے فطرتاً ان کے دل میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ دربار کی شان وشوکت اور علم وادب کی روایت قائم کرنے کا خیال پیدا کیا۔اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ہندوستان سے نقیبوں کو بلوا کر دربار میں ملازم رکھا۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ ساری دلچسپیاں ریاست میں اردو کا ذوق پیدا

> کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان کارنامہ ان کا قائم کیا ہوادارالترجمہ یا محکمہ تالیف وترجمہ تھا جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص طور پر اردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔(25)

رنبیر سنگھ کا دور ریاست کے لیے ایک خوشحال اور پر امن دور تھا۔ بعد میں رنبیر سنگھ کے جانشیں مہاراجہ پرتاپ کو علم وادب سے خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ان ہی کے عہد حکومت میں ملا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں پریم ناتھ در نے آنکھ کھولی۔ در دس سال کے ہوئے تو ریاست کی باگ ڈور مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس وقت ہندوستان کے اور حصوں میں جو تحریک شروع ہوئی تھی اس کا اثر ریاست میں بھی دیکھنے کو ملا۔ مہاراجہ ہری سنگھ تعلیم سے فارغ ہو کر آئے تھے اور آتے ہی ریاست کا کام کاج سنبھالا۔ اس وقت ہندوستان میں جو سیاسی جدوجہد چل رہی تھی اور جو ثقافتی تحریکیں برپا تھیں وہ اس سے غافل نہیں تھے۔

یہ وہ دور تھا جب ریاست کے نوجوان بھی دوسرے ماحول سے روبرو ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو بہت قریب سے دیکھ رہے تھے اور ان نوجوانوں میں نئی زندگی کی امنگیں کروٹیں لے رہی تھی۔ اس نئے شعور کو عام کرنے میں نیا تعلیمی نظام کا بڑا ہاتھ تھا۔ ریاست میں اخبار جاری کرنے کی کوشش جو انیسویں صدی کے وسط سے ہو رہی تھیں ان کو عملی صورت اختیار کرنے کا موقع اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات میں نصیب ہوا۔ اس حوالے سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> 1925ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے حکومت سنبھالی۔ پچھلے سو پون سو برس تک حکومت کی روایت اس خاندان میں جاری وساری رہنے کی وجہ سے ہری سنگھ حکومت کے کام کاج سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے چنانچہ گدی پر بیٹھنے سے کچھ پہلے انھوں نے بعض عوامی تحریکوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور جو مسائل ریاست کے سامنے تھے انھیں سلجھانے کے لیے وسیع نظری سے بھی کام لینا چاہا۔ اس کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست کے سربراہ تھے جس کی رعایا میں نسلی، مذہبی اور تہذیبی گروہ تھے وہ اپنے مخصوص لگاؤ کے تحت

> ان مسائل سے بلند ہو کر معروضی انداز میں سوچنے سے قاصر رہے۔ خاندان سے حکومت کے تسلسل کے سبب سے ان میں فطرتاً امارت پسندی کی ذہنیت موجود تھی۔ تاہم جب وہ مناسب سمجھتے حوصلہ مندی بھی دکھاتے لیکن یہ محدود حوصلہ مندی ان کے آگے کے پیچ در پیچ مسائل سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے ان کا عہد بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔(26)

مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں ذمہ دار حکومت کے لیے مطالبہ شروع ہوا۔ حکومت کو جمہوری نظام پر چلانے کی مانگ شروع ہوئی۔ حکومت کا جمہوری نظام پر نہ چلنے سے لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات ابھرنے لگے۔ اسی رسہ کشی نے شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد، پریم ناتھ در، چودھری غلام عباس، خواجہ محمد صادق اور پریم ناتھ بزاز جیسے کارکنوں کو ابھارا۔ ادھر ہندوستان میں اس وقت آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ پورا ہندوستان گاندھی جی کی لیڈرشپ میں انگریزوں کے خلاف منظّم ہو کر چل رہا تھا۔ ایسے ہی کشمیر میں آزادی کی چنگاری تب پھوٹی جب ظلم و ستم کی تمام حدیں پار ہونے لگی۔ حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے لوگوں کا بھروسہ حکومت سے اٹھنے لگا، خاص کر مسلم طبقہ کا۔ مسلم طبقہ کے ساتھ جو نابرابری ہو رہی تھی اس سے مسلم طبقہ میں غم اور غصہ پایا جانے لگا۔ لیکن 21 جولائی 1924ء کو اس میں اور اضافہ ہوا جب پولیس نے ریشم خانہ میں کام کرنے والے مزدوروں پر حملہ کیا۔ اس واقعہ سے پورے کشمیر میں بغاوت کی لہر دوڑنے لگی۔ ان کی یہ آواز لاہور اور امرتسر تک پہنچی۔ 1924ء کی اس عوامی تحریک کو اگرچہ مہاراجہ نے طاقت اور تشدد سے کچل ڈالا۔ لیکن اس حادثہ کا اثر کشمیری عوام کے اندر گھر کر گیا جو 1931ء میں عبدالقدیر کی گرفتاری پر لاوے کی صورت میں باہر نکلا۔ 1931ء میں کشمیر میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف احتجاج درج کیا گیا۔ اس جلسہ میں شامل ہوئے ایک نوجوان عبدالقدیر نے تقریر کی۔ انھوں نے مہاراجہ کو اچھے سے اپنی تقریر میں کوسا۔ قدیر کو اس تقریر کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ قدیر کی گرفتاری اور ان کی پانچ سالہ قید کی سزا سن کر کشمیری عوام بھڑک اٹھی اور وہ پولیس تھانے میں داخل ہو گئے۔ وہاں پولیس اور لوگوں کے درمیان مار پیٹ ہوئی۔ پولیس والوں نے گولیاں چلائیں اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ یہی وہ دن تھا

جب اہل کشمیر نے تاریخ حریت کے ایک نئے باب کی تمہید اپنے خون سے رقم کی۔ کشمیر کی عوام صدیوں سے غلامی کی شکار رہی اور اس غلامی نے کشمیریوں کو بے حس اور بے عمل بنا دیا تھا۔ کیوں کہ مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگرہ حکمرانوں نے کشمیریوں کو مظلومیت، بے چارگی اور بے بسی کا جامہ پہنایا تھا لیکن 1931ء میں کشمیریوں نے یہ جامہ اتار دیا۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ نے مہاراجہ کے خلاف تحریک شروع کی۔ شیخ محمد عبداللہ اپنی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ہماری تحریک کا دھارا اس وقت تک ایک پہاڑی جھرنے کی پھوٹ کر مستانہ وار چھلک رہا تھا۔ لیکن اب اس کو ایک شیرازہ بند تنظیم کے کناروں میں خرام کے آداب سکھانے کا موقع آ گیا تھا۔ اور قومی مفادات کا تقاضا یہی تھا کہ ایک مستعد جماعت ان کے مقاصد کا ہراول دستہ بنے۔(27)

1931ء میں مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ اس کانفرنس کو قائم کرنے کے بارے میں شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

> ریاست میں مسلم کانفرنس قائم کرنے کے لیے میں جموں بھی گیا اور وہاں نئی تنظیم کی داغ بیل ڈالنے کے لیے چودھری غلام عباس، مستری یعقوب علی وغیرہ سے تبادلہ خیال کیا سبھی لوگ ایک ریاست گیر تنظیم بنانے کے حق میں تھے۔ اس غرض کے لیے مسلم نمائندگان کی ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔(28)

1931ء کے بعد کشمیر میں تحریر و تقریر کی آزادی کا دور شروع ہو گیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے جو اخبار ''وتستا'' کے نام سے نکالا تھا۔ اس میں تحریک آزادی کا سارا لٹریچر تیار ہونے لگا اور مسلم کانفرنس کے صدارتی خطبات بھی شامل ہونے لگے۔ اس دوران تحریک آزادی کے لیے کارکنوں کو حکومت کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے لاہور ہجرت کرنی پڑی اور وہاں سے حکومت کے خلاف مضامین شائع کرنے لگے جس کی وجہ سے ریاست میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ حکومت کے خلاف جن اخباروں میں مضامین شائع ہوئے ان میں

انقلاب، ہمدرد اور ''وتستا'' جیسے اخبار شامل تھے۔

پریم ناتھ در زمانہ طالب علمی سے کشمیر کی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھیں بھی کشمیر چھوڑ کر لاہور جانا پڑا۔ وہاں وہ ادب کی طرف مائل ہوئے اور سیاست کے ساتھ ساتھ ادبی محفلوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ مسلم کانفرنس کو بنے ہوئے ابھی چند برس ہی ہوئے تھے کہ اس میں بدلاؤ لانا پڑا۔ شیخ محمد عبداللہ نے چند برسوں میں ساری صورتحال کو سمجھ لیا اور مسلم کانفرنس کے محدود سیاسی پلیٹ فارم کو خیر باد کہا۔ کیونکہ وہ ایک محدود تنظیم تھی اس کا دائرہ صرف ایک ہی طبقہ تک محدود تھا۔ اس کانفرنس کو لامحدود کرنے کے لیے 1938ء میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ اور خواجہ غلام محمد صادق کا یہ ماننا تھا کہ حکومت کے ظلم کے شکار صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ہندو اور سکھ بھی ہیں۔ اس لیے نیشنل کانفرنس میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

> میری جدوجہد اپنے وطن کی ترقی اور بہبود کے لیے ہے۔ آؤ ہم سب کے سب معمولی فرقہ وارانہ اختلافات سے بالاتر ہو کر عوام کی بہبود کے لیے اشتراک اور تعاون سے کوشش کریں۔(29)

شیخ محمد عبداللہ کے اس سیاسی نظریہ نے بہت سے کشمیری پنڈتوں کو نیشنل کانفرنس کی طرف راغب کیا۔ اور وہ بھی اپنے درد کا اظہار کرنے لگے۔ اس دوران بہت سے غیر مسلم نیشنل کانفرنس میں شامل ہوئے، جن میں سردار بودھ سنگھ، پنڈت جیالال، گردھاری لعل ڈوگرہ، پنڈت کشیپ بندھو، شام لعل واٹ، پنڈت پریم ناتھ بزاز، سردار ہندر سنگھ اور پریم ناتھ در جیسے لوگ شامل تھے۔ نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد اس کے لیے نئے آئین اور نئے پرچم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نیا آئین تیار کرنے اور پرچم بنانے کی ذمہ داری کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کو دی گئی جس کی رہنمائی شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے۔ پریم ناتھ در بھی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ پریم ناتھ در کی تجویز پر پرچم بنایا گیا اور اسے کمیٹی نے منظور کر لیا۔ اس میں گہرے سرخ پس منظر پر سفید ہل کا نشان تھا

یہی بعد میں پوری تحریک کا پرچم بنا اور ریاست کے لاکھوں لوگوں کے دلوں پر لہراتا رہا۔ شیخ محمد عبداللہ اس حوالے سے اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ:

> ہم نے تنظیم کے لیے لال زمین پر سفید ہل والے نشان کا جھنڈا بھی منظور کرلیا۔ اس جھنڈے کا بنیادی ڈیزائن ایک جوشیلے کارکن پنڈت پریم ناتھ در نے پیش کیا تھا جس میں تھوڑی ترمیم کرنے کے بعد منظور کرلیا گیا۔ لال زمین کسان اور محنت کش کے لال لال لہو کی ترجمانی کرتی تھی اور ہل اس کا مرغوب اور کارساز نشان تھا جس کو زمین میں جوت کر وہ گندم کے سنہری خوشے اور دھان کی زرریں بالیاں اگاتا تھا۔ اس دوران کسی کو یقین نہیں تھا کہ ایک دن یہی پرچم مہاراجہ کے محل اور ریاست کے ایوان اقتدار پر لہرائے گا۔(30)

پریم ناتھ در جب تحریک حریت میں تھے تب سے لے کر نیشنل کانفرنس کی جنگ آزادی کی جدوجہد تک آزادی کے لیے جلوس نکالتے رہے، تقریریں، جلسے کرتے رہے۔ رات بھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ میٹنگیں کرتے تھے۔ در کی ان سیاسی سرگرمیوں کی خبر ڈوگرہ حکومت تک پہنچی۔ حکومت نے انھیں سیاسی مجرم قرار دیا تب در کو مجبور ہو کر کشمیر چھوڑنا پڑا اور لاہور کا رخ کیا۔ در 1940ء میں لاہور سے دہلی چلے آئے۔ یہاں انھوں نے ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں سے ملاقاتیں کی۔ پریم ناتھ در پنڈت جواہر لعل نہرو سے کئی مرتبہ ملے تھے لیکن ان کے بیٹے کے پاس چند ملاقاتوں کی ہی تصویریں ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق پریم ناتھ در اور جواہر لعل نہرو کئی عوامی جلسوں اور سیاسی میٹنگوں میں ملے تھے۔ پہلی مرتبہ پریم ناتھ در جب کشمیر کے مسئلہ کو نہرو جی کے پاس لے کر گئے تو نہرو نے ان کو گاندھی جی کے پاس جانے کا مشورہ دیا اور یہ کہا کہ گاندھی جی کی بات مجھ سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ 1940ء میں پریم ناتھ در گاندھی جی سے ملے تب وہ گاندھی جی کو کشمیر کی سیاسی و معاشی حالات سے واقف کرانا چاہتے تھے۔ اور ان کا یہ مقصد تھا کہ گاندھی جی نیشنل کانفرنس کے ساتھ مل کر ڈوگرہ راج کی بھی مزاحمت کریں جیسے وہ برٹش راج کی کرتے ہیں، جس دن وہ گاندھی جی سے ملنے گئے تو اس

دن گاندھی جی کا مون برت تھا۔ یہ دیکھ کر وہ رونے لگے اور گاندھی جی کے پیروں پر گر پڑے۔ گاندھی جی نے ان کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور تختی پر لکھا۔ کیا تم کشمیری ہو؟ یہ دیکھ کر وہ پھر رونے لگے۔ تب گاندھی جی نے ان کو بھروسہ دیا کہ وہ کشمیریوں کی مدد ضرور کریں گے۔ اس کے بعد گاندھی جی ان کے ساتھ کئی میٹنگوں میں ملے۔ 1940ء میں پریم ناتھ در نے فیروز گاندھی سے بھی ملاقات کی۔ فیروز گاندھی نے ان کو سیاسی تقریریں لکھنے اور عوام کے پڑھنے کا طریقہ بتایا۔ 1940ء میں دہلی میں جو تقریر انھوں نے کی۔ جہاں انھوں نے کشمیری برادری کو مخاطب کیا تھا۔ اس تقریر کو لکھنے میں فیروز گاندھی نے ان کی مدد کی تھی۔ 1943ء میں نئی دہلی میں انڈین یونین میٹنگ ہوئی جس میں نیشنل کانفرنس کی قیادت پریم ناتھ در نے کی اور کانگریس کی جانب سے گاندھی جی شامل ہوئے اس میٹنگ کا مقصد تھا کہ کس طرح سے جموں و کشمیر کو انڈین یونین میں شامل کیا جائے۔ پریم ناتھ در نے کشمیر سے دور رہ کر بھی کشمیر کے سیاسی صورتحال کو قریب سے دیکھا۔ 1947ء سے لے کر 1948ء تک کشمیر میں جو سیاسی گھمسان شروع ہوا۔ اس گھمسان کو در نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ پیش کیا۔ قبائلیوں نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو اس منظر کو پریم ناتھ در نے اپنی کہانی میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

> نہ جانے کتنے قبایلی ندی پار سے بارہ مولہ میں آ چکے تھے نہ جانے کتنے آنے والے تھے۔ یہ دیکھنے کے بعد مادھو اپنے آپ رونے لگا۔ کہرام مچ گیا تھا۔ جہاں گولیاں چیخیں آگ دھواں اور بھونچال ایک ہو گئے تھے، لیکن ایسے میں بھی مادھو کے ذہن میں ایک بات صاف تھی۔ ادھر پڑوس والا مکان خاموش تھا۔ خاموش ایسا کہ جیسے پھوس کے گھونسلوں میں چڑیا بھی بھانپ گئی ہوں۔ وہ بیچ کی دیوار کے سہارے پڑوس کے مکان میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس لمحے دھڑام سے ایک بوجھ گرا اور اس کے اپنے دروازے کے ساتھ ٹکرایا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ دروازوں سے لال لال خون چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا۔ دروازے کے پیچھے سے پڑوس کی منی چیں چیں کرتی ہوئی آ گئی اور اس کے دروازے پر ہاتھ مار مار کر کہنے لگے۔ کاکا۔ اے مادھو کاکا بھائی لال کا سل اتنے میں مادھو کی چھت پر ایک قبائلی پٹھان آیا اور آتے ہی کہنے لگا زن لاو، زن لاو لاو کافر کدھر ہے زن۔ (31)

اس دوران کشمیر میں جو سیاسی ہلچل رہی اس کو در نے اپنی کہانیوں میں بے خوف ہو کر پیش کیا۔ 1947ء میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ تشدد ہو رہا تھا اس وقت کشمیر ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں امن اور بھائی چارہ قائم تھا۔ کشمیر پر جب حملہ ہوا تو کشمیر کی بھائی چارگی ایک مثال بن کر سامنے آئی تھی۔ تبھی تو گاندھی جی کو کہنا پڑا کہ مجھے امن کی کرن کہیں سے دکھائی دے رہی ہے تو وہ کشمیر ہے۔ پریم ناتھ در نے اس بھائی چارگی کو اپنے افسانہ ''گدھ'' میں پیش کیا ہے۔ اس افسانہ کے ایک اقتباس میں پریم ناتھ در لکھتے ہیں کہ:

> گرمی کی ایک رات جب کمہار گہری نیند سو رہا تھا تو اچانک اس کو پہاڑی پر روشنی کی ایک تیز لہر گھومتی ہوئی نظر آئی جس کی وجہ سے وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور کھڑکی بند کر کے وہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھنے لگا۔ اچانک اس کا ایک ہم مذہب ہم قوم شخص اس کے سامنے آ گیا اور اس سے قبل کہ وہ السلام علیکم کرتا دو لوگوں نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑ لی اور منہ بند کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں نفرت تھی ایک خونی سازش تھی۔ ان کی بولی کاٹنے کھانے والی تھی جسے ان پڑھ بوڑھا کمہار سمجھ نہ سکا۔ ان میں سے ایک نے کمہار پر رائفل تان کر پوچھا کہ اس کے گاؤں میں کافروں کے گھر کہاں ہیں۔ کمہار سمجھا کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اپنی برادری کے لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کمہار نے بتایا کہ اس گاؤں میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ کافر کیا ہے۔ کمہار پاس میں سو رہی اپنی بیوی سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کافر ہیں اور اپنے لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن ظالموں نے یہ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لوہے جیسے سخت ہاتھ نے اس کی انگلیوں کو دبایا۔ بے بس کمہار درد سے کراہنے لگا وہ زور لگا کر بولا کوئی کافر نہیں ہے۔ (32)

پریم ناتھ در نے اس وقت کے ہندو مسلم بھائی چارہ کی اچھے سے عکاسی کی ہے۔ پریم ناتھ در نے جب آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی تو وہ عملی سیاست سے دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن ان کی کشمیر کی

سیاست پر پھر بھی گہری نظر رہی۔ شیخ محمد عبداللہ سے در کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس تعلق کی بنا پر وہ آل انڈیا ریڈیو میں O.S.D ہو گئے اور کچھ سال بعد ڈائرکٹر آف پروگرام، مگر کشمیر کے معاملات سے ان کی وابستگی قائم ہی رہی۔ 1953ء میں شیخ عبداللہ کو ریاست کے وزیر اعظم کے عہدہ پر سے ہٹا کر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا اور ان کی جگہ بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ 1963ء میں بخشی غلام محمد کو بھی اپنے عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا اور ان کی جگہ شمس الدین نے لی۔ حکومتوں کے آنے جانے کے اس سلسلے سے ریاست میں لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری ہوا اور عوام خستہ حالی کا شکار ہوتی گئی۔ حکومت کی چالاکی اور عوام کی بے بسی کو دیکھ کر پریم ناتھ در بے چین ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ:

> پریم ناتھ در اور میں جب اکھٹے بیٹھتے تھے تو اکثر کشمیر اور کشمیر کی سیاست پر بات چیت کرتے اور یہ بات چیت ہمارے بحث مباحثے کا موضوع بن جاتی تھی اور ہم اکثر اس امر میں باہمی طور پر متفق ہوتے تھے کہ حکومت ہند کو اس معاملے میں یوں نہیں کرنا چاہیے اور یو کرنا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے اور وہ ہونا چاہیے۔ پریم ناتھ در نے اکثر مجھ سے یہ کہا کہ یار یہ بتاؤ کہ حکومت ہند جو کروڑوں بلکہ اربوں روپے جموں و کشمیر کی ترقی کے لیے حکومت جموں و کشمیر کو دے رہی ہے وہ کہاں جا رہا ہے میں اس سوال کا کیا جواب دیتا؟ ہم دونوں اس معاملے میں بے اختیار تھے اور بے بس۔ لیکن اتنا جانتے تھے کہ جموں و کشمیر کے عمال حکومت کا روپے کا صحیح استعمال نہ کرنا اور حکومت ہند کا چشم پوشی کرنا ضرور ایک دن رنگ لائے گا۔ (33)

پریم ناتھ در کشمیر کی سیاست میں ان لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے جو پڑھے لکھے اور عوام خدمت گزار ہوں۔ در کشمیر کے نوجوانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تھے۔ تاکہ ریاست میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال ختم ہو جائے۔ پریم ناتھ در کے متعلق شمیم احمد شمیم لکھتے ہیں کہ:

> در صاحب سے میری پہلی ملاقات 20 برس قبل دہلی میں ہوئی تھی جب وہ آل انڈیا

> ریڈیو میں ملازم تھے۔ غالباً ان دنوں وہ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی برائے کشمیر تھے۔ یہ 1956ء کی بات ہے مجھ سے ملنے کے بعد انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں کہ جو وہ کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکے۔ وہ کہتے کہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن اور جوانی کی یاد آتی ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ تم میرے ادھورے خواب پورا کروگے۔ 1964ء کی بات ہے کہ میں نے پریم ناتھ در کو سیاست میں حصہ لینے کے اپنے عزم سے آگاہ کیا تو انھوں نے نہ صرف میرے عزائم اور ارادوں پر مجھے مبارکباد دی بلکہ بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ تمہاری اصلی جگہ وکالت اور سیاست ہے تمہارا مستقبل شاندار ہے اور تم سرکاری ملازمت کے پنجرے میں رہ کر اپنی ذات کے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔ 1967ء میں جب میں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے شوپیاں کے حلقہ انتخاب سے اپنے کانگریسی حریف کو شکست دی تو در صاحب نے میرے نام ایک محبت بھرے خط میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔(34)

جموں وکشمیر میں اس دوران غلام محمد صادق کی سرکار تھی۔ لیکن چند سال گزرنے کے بعد صادق کی سرکار گر گئی۔ ان ہی دنوں شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ریاست میں صادق کے بعد میر قاسم ریاست کے نئے وزیر اعلیٰ بنے۔ ان کی سرکار بھی اپنا پورا عہد نہیں نکال سکی اور گر گئی۔ بعد میں ریاست میں الیکشن ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ الیکشن جیت کر دوبارہ اقتدار میں لوٹے۔ پریم ناتھ در ان دنوں آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے اقتدار میں آنے کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو کے فیلڈ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ ایک آدھ سال بعد وہ وہیں سے ریٹائر ہوئے جس کے فوراً بعد انھیں شیخ محمد عبداللہ نے اپنی ریاست میں مشیر برائے اطلاعات مقرر کیا۔۔ وہ اس عہدے پر 1975ء سے اگست 1976ء تک فائز رہے۔ اس وقت ڈاکٹر فاروق عبداللہ وزیر صحت و خاندانی فلاح و بہبود کے عہدے پر تھے۔ سال 1975ء میں شیخ محمد عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کے آئین پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ آئین تحریر کرنے کا کام فاروق عبداللہ کی قیادت میں ہو رہا تھا جو کہ اس وقت نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس موقع پر پریم ناتھ در نے اہم رول ادا کیا۔ اور انھیں فاروق عبداللہ کے قریب آنے کا موقع بھی ملا۔ شیخ عبداللہ کو اس وقت آئین تحریر کرانے کی ضرورت اس

لیے محسوس ہوئی کیونکہ وہ نیشنل کانفرنس کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی لانا چاہتے تھے تاکہ ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے لیے آگے بڑھنے کی راہ آسان ہو جائے۔

سماجی صورتحال:

کشمیر صدیوں سے کئی تہذیبوں اور معاشروں کا گہوارہ رہا ہے۔ کشمیر کے قدیم سماج میں ناگ اور پشاچ قوم کے لوگ آباد تھے۔ پہاڑی ڈھلانوں میں ان کی بستیاں تھیں۔ جنتر منتر کا استعمال یہ لوگ جانتے تھے۔ جب آریہ قوم کے قبیلے کشمیر میں آباد ہوئے تو ناگوں اور آریوں میں کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر ایک صلح ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آرین گرمیوں کا موسم وادی میں بسر کریں۔ اور ناگ اور پشاچ اپنی گرمیاں پہاڑی علاقوں میں گزاریں۔ سردیوں میں آرین کشمیر کو چھوڑ کر جموں، پنجاب، راجستھان اور گجرات کے علاقوں میں اپنی زندگی بسر کریں۔ کشمیر کی اس وقت کی صورتحال کو رسالہ آج کل کشمیر نمبر میں جیالال ناظر نے یوں بیان کیا ہے کہ:

> ایک دفعہ چندر دیونامی برہمن سردیوں میں کشمیر میں ہی رہا۔ ادھر سے ناگ جب پہاڑوں سے اتر کر کشمیر میں وارد ہوئے تو انھوں نے چندر دیونامی برہمن کو دیکھ لیا وہ اسے اپنے راجہ نیل ناگ کے پاس لیے گئے۔ نیل ناگ نے برہمن کی زبانی آرین نسل کے لوگوں کی قابل رحم حالت سن لی اس نے ایک کتاب برہمن کے حوالے کی اور کہا کہ تم لوگ اس کتاب میں دی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے سے ناگوں کو اپنا دوست پاؤ گے۔ اس کتاب کا نام بعد میں نیل مت پوران مشہور ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ناگ پشاچ کے لوگوں کے ساتھ آرین نسل کے لوگ گھل مل گئیں اور کشمیریوں کا ایک مشترکہ معاشرہ وجود میں آیا۔(35)

کشمیر کے لوگوں پر صدیوں سے ہر قوم اور مذہب کا اثر رہا ہے۔ اشوک کے زمانے میں بدھ دھرم کشمیر کا سرکاری مذہب بنا۔ کشمیر میں ہی ہین یان اور مہایان فرقوں کے فلسفے نے آخری صورت اختیار کی۔ بدھ مت نے کشمیریوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اثر سے امن پسند رہنا کشمیریوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔

کشمیری سماج کا سب سے بڑا پہلو اس کی روایتی سمجھ رہا۔ ان کا یہ ماننا رہا کہ دین دھرم فرد کے اپنے ایمان کی بات ہے کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آتا۔ نہ دوسرے کے ایمان کو بگاڑ سکتا ہے۔ کشمیر میں رشیوں فقیروں کے دور میں بھی یہی بات تھی اور بعد میں بھی یہی بات رہی۔ اس کے تاریخی شواہد للتا دتیہ اور زین العابدین کے دور حکومت میں بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دونوں کی بے انتہا طاقت تھی دونوں جو چاہتے کر سکتے تھے۔ لیکن للتا دتیہ نے ہندو ہوتے ہوئے اس وقت کے دھرم بدھ مت کو ریاست میں پھیلانے کا موقع دیا۔ اور دونوں دھرموں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے مذہب کے حوالے سے بحث مباحث کروائے۔ ایسا ہی زین العابدین نے کیا۔ زین العابدین سے پہلے کشمیری ہندو رفیوجیوں کی طرح اپنی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ سکندر کی حکومت کے دوران کشمیری ہندو کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا تھا۔ لیکن زین العابدین نے جیسے ہی حکومت سنبھالی تو بھاگے ہوئے ہندو واپس لوٹ آئے اور کشمیر میں ایک نئی فضا قائم ہوئی بھائی چارگی کی۔ پریم ناتھ در کے عہد کی سماجی صورتحال کا جائزہ لیں تو اس عہد میں بھی وہی رسم و رواج وہی بھائی چارگی دیکھنے کو ملتی ہے جو صدیوں سے ریاست کے لوگوں کا حصہ تھی۔ جموں و کشمیر کا سیاسی اور سماجی پس منظر یہاں کی تہذیبی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے لوگ جب اپنے سیاسی اور سماجی پس منظر کو سامنے لاتے ہیں تو ہر طرف انگریزوں کی زور زبردستی اور ظلم کی داستان نظر آتی ہے۔ لیکن کشمیر کا سیاسی و سماجی پس منظر اس کے برعکس ہے۔ جموں و کشمیر انگریزوں کی پناہ میں کبھی نہیں رہا۔ لیکن اس کی بھی خرید و فروخت ہوئی اور سامراجی طاقتیں اس کا برابر استحصال کرتی رہیں۔ اور یہاں کی عوام کا ذہن غلامی کا شکار ہوتا رہا۔ ریاست کشمیر بہت سے حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہی۔ ایک حکمراں یہاں کے لوگوں کے مذہب کو متاثر کرتا تھا تو دوسرا صنعت و حرفت کو۔ کبھی مذہب میں مداخلت ہوتی تو کبھی غریب عوام کے ہاتھوں سے کھانے کا نوالا چھین کر لے جاتے تھے۔ کوئی یہاں کے علمی ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کر کے لے جاتا تھا تو کوئی یہاں کی طبعی قوتوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ جموں و کشمیر کا سماج اور یہاں کی تہذیب و تمدن ہمیشہ سے متاثر ہوتا رہا اور اس کے اثرات کشمیری عوام کے ذہن پر مرتب ہوتے رہے۔ ان اثرات نے کشمیری عوام کے ذہن کو اندر ہی اندر بغاوت کے لیے تیار کیا۔ اور یہاں کی عوام کے اذہان کو برصغیر کی دوسری ریاستوں کے لوگوں سے مختلف بنا دیا۔ ڈوگرہ راج

میں کشمیریوں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں اور پریشانیوں کا اضافہ ہوا۔ڈوگرہ حکمرانوں نے کشمیری سماج کو حاشیہ پرلا کر کھڑا کر دیا تھا۔خاص کر مسلمانوں کو اس ظلم و جبر کے خلاف لوگوں نے اپنی آواز بلند کی اور آزادی کی تحریک کو ہوا دی۔لیکن حکومت کے رخ میں پھر بھی نرمی نہیں آئی۔کشمیر پر بہت سے ادیبوں نے لکھا ہے لیکن ریاست سے باہر کے ادیبوں نے جب بھی کشمیر کے بارے میں لکھا ہے تو ان کی تحریروں میں رومانی فضا چھائی رہتی ہے اور جب کوئی کشمیر کا رہنے والا لکھتا ہے تو کشمیر کے سماج کی روتی بلکتی ہوئی زندگی سامنے آتی ہے اور ان کی تحریروں کی فضا خون سے بھری ہوتی ہے۔ پریم ناتھ در نے بھی کشمیری سماج کی سکستی بلکتی ہوئی زندگی کو اپنے افسانوں کے ذریعہ پیش کیا۔در نے کشمیر کے سماج پر ہو رہے ظلم و ستم کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو بھی ابھارا ہے۔ہندوستان کی تقسیم کے وقت مختلف علاقوں میں مذہب کے نام پر بہت سے فسادات ہوئے۔کشمیر کا بھی بٹوارہ ہوا۔اس کے سینے پر بھی تقسیم کی لکیر کھینچ گئی اور سینکڑوں خاندانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑا لیکن مذہب کے نام پر کشمیر میں کوئی فساد نہیں ہوا۔کشمیری ہندو اور مسلمان کا ایک دوسرے سے قریبی رشتہ رہا۔ جہاں ایک طرف مسلمان نماز میں سجدہ کرتا تو دوسری طرف ہندو اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتا۔کبھی کسی ہندو کی غیر حاضری میں اس کے گھر کی رکھوالی مسلمان کرتا اور کسی مسلمان کی غیر حاضری میں ہندو اس کے گھر کی رکھوالی کرتا۔کشمیر میں یہ رواج برسوں سے قائم تھا جو پریم ناتھ در کے عہد میں بھی چلا آ رہا تھا۔اس حوالے سے پریم ناتھ در اپنے مضمون ''کشمیری شخصیت'' میں لکھتے ہیں کہ:

> حضرت آدم کے دو ہی بیٹے تھے ایک نے قبر کو پسند کیا ایک نے شمشان کو یہ ہے کشمیری شخصیت کا وہ بڑا پہلو جس کے مطالعے سے ایک بہت بڑا جھگڑا دنیا سے مٹ سکتا ہے کیونکہ تبھی ناواقفوں کو سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ کشمیری اپنے سیاسی فیصلوں یا اپنے سماجی اور اقتصادی تجویزوں میں مذہب کے دخل کو کیوں غلط کہتا ہے۔(36)

ریاست جموں و کشمیر میں حکمرانوں کی غلط پالیسیوں سے سماج میں پھوٹ بھی پڑی جیسے کہ ڈوگرہ عہد میں ہی دیکھیے تو ڈوگرہ حکمرانوں کا جھکاؤ کشمیری پنڈتوں کی طرف زیادہ رہا اور مسلمانوں پر بہت سے ٹیکس لگائے

گئے۔اس حوالے سے پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں کہ:

> مسلم عوام کی غربت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔وہ ایسے بوسیدہ کپڑے پہنتے جو پوری طرح ان کے جسموں کو بھی نہ چھپاتے ان کے حالات ان کے فقیر اور بھکاری ہونے کی غمازی کرتے گویا وہ انسان نہیں تھے اور نہ حکومت کی مہربانیوں سے بہرہ مند ہونے کے کسی طور اہل مستحق تھے۔(37)

کشمیری سماج نے ظلم وستم کا سامنا کرنے کے باوجود بھی بھائی چارگی اور رواداری کو نہیں چھوڑا۔ حکمرانوں نے تو سماج کو بانٹنے کی پوری کوشش کی۔معاشی اور اقتصادی طور پر تو حکمرانوں کو کامیابی ملی۔لیکن ان کی بھائی چارگی اور رواداری کو نہیں بانٹ سکے۔کشمیری سماج کی رواداری اور بھائی چارگی کے حوالے سے پریم ناتھ در رقم طراز ہیں کہ:

> قبایلیوں نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو وہ ہندو کے گھروں کا پتہ پوچھنے لگے تب کشمیریوں میں سے ایک کشمیری سامنے آیا اور کہنے لگا کہ بابا یہ بڑے خان ہیں یہ ہمیں اور اسلام کو بچانے آئے ہیں۔بوڑھا کمہار اب تک ان خونی درندوں کی بات نہیں سمجھ پایا تھا اور حیرت سے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا تبھی اس کشمیری نے ہندو لفظ کا ترجمہ ''بٹ'' یعنی بٹ خاندان کیا۔اور پوچھا کہ اس کا بٹ خاندان سے کیا رشتہ ہے۔کمہار نے بٹ سنتے ہی اشارے سے بتایا کہ وہاں پر ایک گھر ہے جن کو وہ اپنے مٹکے دیتا ہے جن کی پوجا ہوتی ہے۔اتنا سن کر قبائلی بھیڑیے کمہار کو آزاد کر کے اس گھر کی طرف دوڑتے ہوئے گئے۔لیکن کمہار اب تک ان کے مقاصد سے غافل تھا۔ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں یکا یک ایسا کہرام مچا کہ پوری پہاڑی ہلنے لگی۔چاروں طرف کاٹو، مارو، لے جاؤ اور بندوق رائفل کی گولیوں کی آوازیں، بچوں اور عورتوں کی چیخیں گونجنے لگیں ان تمام باتوں نے ایک خوف کا سماں پیدا کر دیا۔بوڑھا کمہار اس وقت تک ان بے بس معصوم کشمیریوں

> کے رونے کی وجہ نہ سمجھ سکا تھا۔اس نے چیخ کر اپنے بیٹے رسول کو آواز دی۔ رسول لاٹھی لے کر بٹ کے آنگن کی طرف لپکا مگر ایک گولی نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ قبائلیوں نے وہاں پہلے چاک پھوڑا، پھر گھڑوں، پیالوں اور ہانڈیوں کو توڑا اور انھوں نے اس بھٹی کی آگ سے سارے گاؤں کو جلا دیا۔ ہر طرف آگ کے شعلے اور دھواں اٹھنے لگا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر بوڑھا کمہار زمین پر گر پڑا۔(38)

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے متعلق دیکھیے تو پریم ناتھ در کے عہد میں اور آج بھی کشمیر کے پہاڑی سماج کو شہری لوگوں سے زیادہ مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ پہاڑی علاقوں میں لوگوں کی زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنی میدانی علاقوں کے باسیوں کی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ پہاڑوں اور وادیوں میں بسنے والے لوگ انتہائی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ یہاں صرف مرد حضرات ہی نہیں عورتیں بھی بھاری وزن اٹھا کر اوبڑ کھابڑ پہاڑی راستے طے کرتی ہیں۔ یہ کشمیری سماج کا روزمرہ کا معمول رہا ہے۔افسانہ ''گیت کے چار بول'' کا ایک منظر ملاحظہ ہوں:

> جفاکش کسان گہرے سانس لیتے ہوئے شہریوں کی خاطر پہاڑوں سے برف بھی جمع کرتے ہیں اور دوڈھائی من کے گھاس کے بوجھ کو پیٹھ پر اٹھائے شہر سری نگر میں لے آتے ہیں۔شہر کی سرحدوں پر شہری برف فروش ان کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر اس ٹوکری کو اپنی سفید پگڑی پر رکھ کر یہ برف جیسا برف فروش جھوم جھوم گلیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔ جب دوپہر کی تیز دھوپ میں بھی وہ گلی میں گھومتا ہے تو اندر دبکے ہوئے کشمیری ہلکی سانس لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آواز اور اس کا گیت اس کی برف سے بھی ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔(39)

کشمیر میں خانہ بدوش قبائلی لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ان کے الگ الگ قبیلے ہیں۔ یہ لوگ ذریعہ معاش کی تلاش میں اپنے پورے قبیلے کے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے

جاتے رہتے ہیں۔ کشمیر کے قبائلی لوگوں میں گوجر اور بکروال دو قبیلے مشہور ہیں۔ یہ لوگ بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے اور خچر مختلف مویشیوں کو پالتے ہیں اور ان کے دودھ اور اون پر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں یہ لوگ پیر پنچال کی پہاڑیوں بارہ مولہ کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کی اپنی چراگاہیں ہوتی ہیں۔ ان چراگاہوں کو علاقائی زبان میں ''ٹوک'' کہا جاتا ہے۔ موسم سرما میں یہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ یہ قبائلی برسوں سے کشمیر میں پائے جاتے ہیں۔ پریم ناتھ در نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی۔ اس عہد میں نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کا بول بالا تھا۔ کسانوں کو ظلم وتشدد کا شکار بنایا جارہا تھا۔ ڈوگرہ سرکار کے اس ظلم سے بچنے کے لیے کشمیری لوگوں پنجاب اور لاہور جاتے تاکہ جو ٹیکس ان پر لگا ہوتا اس کو ادا کیا جائے۔ آزادی کے بعد بھی کشمیری عوام کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ لوگ اس ہی لوٹ کھسوٹ، جبر اور ظلم کے شکار بنے۔ پاکستان کی دخل اندازی سے اکثر کشمیری عوام کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

پریم ناتھ در کی سماجی سرگرمیاں:

پریم ناتھ در اپنے طالب علمی کے زمانے سے سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے سری نگر میں بے روزگار نوجوانوں کی مدد کے لیے ''انجمن بے کاراں'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ یہ انجمن نوجوانوں میں سماجی بیداری کرنے کا کام انجام دیتی تھی۔ 1938ء میں یہ انجمن مسلم کانفرنس میں ضم کردی گئی۔

(2) کشمیری سہا یک سمیتی: پریم ناتھ در جس دوران دہلی میں تھے۔ تب انھوں نے تمام پڑوسی کشمیریوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی ایک انجمن قائم کریں۔ ان کے اس مشورہ کا سب نے خیر مقدم کیا اور انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا پہلا دفتر قرول باغ دہلی میں قائم ہوا۔ پریم ناتھ در اس کے صدر منتخب کیے گئے تھے۔ یہ سمیتی اب بھی کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کررہی ہے۔

(3) پمپوش انکلیو کا قیام:

پریم ناتھ در کو کشمیر سے اور کشمیریوں کی تہذیب وتمدن سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے دہلی میں رہ کر بھی انھوں نے کشمیر کی تہذیب وتمدن کو نہیں چھوڑا۔ وہ کشمیریوں کو متحد اور اپنے طور طریقوں پر کاربند دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دہلی میں بکھرے ہوئے کشمیریوں کو ایک ہی علاقہ میں بسانے کی کوشش کی۔ ان کا یہ ماننا

تھا کہ دہلی میں اگر کشمیری الگ الگ علاقوں میں رہائش پذیر رہے تو ان کی ثقافت اور شناخت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے دہلی میں رہنے والے کشمیریوں کو کسی ایک علاقہ میں اکھٹا رہنا چاہیے۔ اپنے اس کام کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے دوستوں ہریش چند اور شام لال سے بات کی۔ ان کے علاوہ انھوں نے پارلیمنٹ کے سکریٹری اور چیف الیکشن کمشنر آف انڈیا کے ساتھ مل کر 1950ء میں کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی اور نئی دہلی کے علاقے گریٹر کیلاش میں حکومت سے زمین حاصل کر کے 1960ء کو پمپوش انکلیو آباد کیا۔

(4) **پمپوش اسکول کا قیام:** پریم ناتھ در نے اپنے ہم خیال پڑوسیوں اور دوستوں کے تعاون سے 1974ء میں ایک ''پلے وے'' اسکول قائم کیا جو کہ اب بھی قائم ہے۔ یہ اسکول کشمیری ایجوکیشن اینڈ سائنس سوسائٹی کے تحت چلتا ہے۔

حواشی:

(1) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن، 1991ء، ص، 8۔

(2) ایضاً، ص، 9۔

(3) ایضاً، ص، 11۔

(4) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص، 2۔

(5) رفعت سروش، یادوں کے دریچے، دہلی: اردو اکادمی، 2010، ص، 71۔

(6) برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 1992، ص، 33۔

(7) شیخ عبداللہ، آتش چنار، سری نگر: علی محمد اینڈ سنز، 1982، ص، 4۔

(8) ڈاکٹر پریمی رومانی، اظہار، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 2007ء، ص، 21۔

(9) برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 1992، ص، 33۔

(10) ایضاً، ص، 34۔

(11) محمد یوسف ٹینگ، ساز کی لے کو تیز کرو، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز اسٹڈیز، 1979،

ص،22۔

(12) رسالہ' آج کل' کشمیر نمبر، جلد نمبر14، شمارہ نمبر1، 1955ء، ص،29۔

(13) ایضاً، ص،31۔

(14) برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 1992ء، ص،33۔

(15) پریم ناتھ پردیسی، میں اور میرے افسانے، ص،15۔

(16) رامانند ساگر، آئینے، لاہور: مسز لاچپت رائے اینڈ سنز پبلشرز، 1946ء، ص،93۔

(17) شیرازہ، جلد53، شمارہ نمبر12، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ص،12۔

(18) برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 1992ء، ص،40۔

(19) شیرازہ، جلد51، شمارہ نمبر4، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1971ء، ص،22۔

(20) ایضاً، ص،74۔

(21) ڈاکٹر پریمی رومانی، اظہار، جموں، رچنا پبلی کیشنز، 2007ء، ص،74۔

(22) عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1982ء، ص،224۔

(23) ایضاً، ص،298۔

(24) ایضاً، ص،81۔

(25) ایضاً، ص،274۔

(26) ایضاً، ص،275۔

(27) شیخ محمد عبداللہ، آتش چنار، کشمیر: علی محمد اینڈ سنز، 1982ء، ص،156۔

(28) ایضاً، ص،106۔

(29) ایضاً، ص،225۔

(30) ایضاً، ص،240۔

(31) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص،47۔

(32) ایضاً،ص،53۔

(33) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن، 1991ء، ص،22۔

(34) شمیم احمد شمیم، پریم ناتھ در میرا یار نمبر، روزنامہ آئینہ،10 دسمبر 1976ء، ص،

(35) رسالہ' آج کل' (دہلی)، کشمیر نمبر، 1955ء، ص،35۔

(36) پریم ناتھ در، کشمیری شخصیت، رسالہ' آج کل' (دہلی) کشمیر نمبر 1955ء، ص،17۔

(37) پریم ناتھ بزاز، کشمیر میں جدوجہد آزادی، سری نگر: کشمیر پبلشر کمپنی، 1954ء، ص،32۔

(38) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص،42۔

(39) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص،3۔

باب دوم

پریم ناتھ در کے فکشن میں کشمیری عوام کے مناظرِ زندگی کی حقیقی تفسیریں

انسان جب جنگلوں میں رہتا تھا تو قوت فہم سے عاری تھا۔ اسے کسی شئے کا علم نہیں تھا۔ وہ بھی دوسرے جانوروں کی طرح ہی رہتا تھا۔ اس کی کوئی سرحد نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں شعور آتا گیا۔ اس نے نئی نئی چیزیں ایجاد کرنا شروع کی جیسے آگ، پہیہ کی ایجاد اور بیل گاڑی۔ اپنے لیے گھر بنانے کی ترکیب سوجھی اور وقت بسر کرنے کے لیے ایک دوسرے کو کہانی سنانے کا عمل شروع کیا۔ یہیں سے داستان نے جنم لیا، جس میں جنات کہانی سنائی جانے لگی۔ سماج میں یہ لوگ قبیلے کی شکل میں رہتے تھے۔ ان کی رہنمائی کے لیے ایک سردار ہوتا تھا پھر بادشاہت کا زمانہ شروع ہوا۔ انسان نے آہستہ آہستہ جنگلوں اور پہاڑوں سے اپنے رشتے میں کمی کی اور کھیتوں سے اپنا ناطہ جوڑا۔ انسان کو جب اس کام میں لطف محسوس ہونے لگا تو اس کی کہانیوں کا انداز بدلا۔

اس بدلے ہوئے انداز میں بھی کہانی کے وہ بنیادی محرکات قائم رہے جو اس کی حیات کے ابتدائی دور کی خصوصیات میں شامل تھے۔ اب بھی کہانیاں زندگی کی تسکین کا باعث تھیں۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیل، تصور اور رومان کے ایک جہان تازہ کی تصویر ہوتی تھی جسے سن کر انسان اپنے تخیل کی دنیا میں کھو جاتا تھا۔ کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔ داستانوں کی تاریخ انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوتی ہے۔ ابھی اردو میں داستاں گوئی کا عہد ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ کہانی کی ایک نئی صنف نے جنم لیا۔ نذیر احمد

نے کہانی کوتخیل اورتصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ کہانی کو تفریح کی چیز سمجھنے کے بجائے معاشرتی زندگی کی ترجمانی کا عمل سکھانے کی تعلیم دی۔ اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنا ناول ''مرآۃ العروس'' لکھ کر حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کے بعد دیگر ادبا جیسے عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن ہوئے۔ سماج انسان کے گروہ کا نام ہے۔ انسان جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اسی ماحول میں پل بڑھ کر اس کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سماج ایک حقیقت بن جاتا ہے جو زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں یعنی تعلیم، معیشت، خاندان، عقائد اور تہذیب و تاریخ وغیرہ کا احاطہ کرتا ہے۔ ادب اور سماج کا رشتہ افلاطون کے زمانے سے محسوس کیا جاتا ہے اور یہ رشتہ اب بھی قائم ہے۔ ہرڈر سے لے کر کارل مارکس تک مختلف ادب شناسوں نے مختلف طریقوں سے ادب کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی۔ جہاں کسی نہ کسی طرح سماج کا عمل دخل ضرور تھا۔

ارسطو نے ادب کو انسان اور اس کی زندگی سے وابستہ عمل و افکار کی ترجمانی کا وسیلہ جانا۔ ادب اور ادیب کا سماج سے اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو ایک دوسرے کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ ادب سماج کا وہ آئینہ ہے جس میں ہم سماج میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات کا عکس دیکھتے ہیں۔ زندگی، موت، شادی، غم، محبت، عداوت غرض ان تمام حادثات و واقعات میں مبتلا ہونے والے یا ان سے متاثر ہونے والے افراد اور ان کا ردعمل وغیرہ۔ ایسے ہی اردو ادب میں نذیر احمد کے بعد جو ادبا آئے تو انھوں نے حقیقی زندگی کی ترجمانی کی۔ ادھر کشمیر میں پریم ناتھ در نے جب آنکھ کھولی اس وقت اردو ادب کا ادبی دنیا میں سنہری دور چل رہا تھا۔ پریم ناتھ در نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1945ء سے کیا۔ انھوں نے کشمیر کی حقیقی زندگی کو اپنے افسانوں کے ذریعہ قاری تک پہونچایا اور اپنے افسانوں میں کشمیر کے دبے کچلے لوگوں کی آواز کو بلند کیا۔

کشمیر کے متعلق اکثر افسانہ نگاروں نے لکھا ہے لیکن ان کی تحریریں کشمیر کی خوبصورتی میں ہی الجھ گئی۔ چند افسانہ نگاروں نے کشمیر کی حقیقی زندگی کے متعلق لکھا جن میں راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کا نام آتا ہے۔ کرشن چندر نے تو کشمیر کے متعلق بہت سے افسانہ لکھے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں حقیقی زندگی سے زیادہ رومانی زندگی کو بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں پر رومانیت کا غلبہ رہا، پریم ناتھ در نے ایسا نہیں کیا۔ در نے پریم

ناتھ پردیسی کی طرح کشمیر کے مسائل کو ابھارا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کھانے پینے سے لے کر رہن سہن تک تمام مناظر کو تحریر کیا۔ان کے افسانوں کا مطالعہ کر کے قاری کے ذہن میں کشمیر کی ایک الگ تصویر سامنے آتی ہے۔کشمیر کی مظلوم اور جفاکش عوام کی جھلک در کے افسانوں میں ملتی ہے۔ پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کم کیا ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات کے متعلق سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

> کشمیر جو بار باران کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لیے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لیے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں اور وہ حقیقت یہاں کی ناداری، بھوک اور جاگیردارانہ نظام کی ماری ہوئی زندگی ہے۔ پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک ٹٹول کر پہنچے جاتے ہیں اور ان حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھی غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ در کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے جیسے ہمارے پاس سانس لے رہی ہو۔(1)

پریم ناتھ در نے کشمیریوں کی درد بھری زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے افسانوں میں شدید المیہ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ المیہ انسانی قدروں اور معاشرے کی خستہ حالی کا ہے۔ پریم ناتھ در کے افسانوں میں کشمیریوں کی جفاکشی، دیانت داری، سادگی اور غیر جانبداری دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں کشمیر کے رسم ورواج، کھانوں اور میووں کا ذکر بھی ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے ''گیت کے چار بول''، ''کاغذ کا واسودیو''، ''چڑھاوا''، ''نیلی آنکھیں''، ''کوفتہ''، ''لڑوی بس'' اور ''آخ تھو'' قابل ذکر ہیں۔ در کے افسانوں میں کشمیر کے جھرنوں، آبشاروں اور سبزہ زاروں کا ذکر نا کے برابر ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو پیش کیا ہے۔ در کے افسانوں میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کا

رنگ نظر آتا ہے جیسے ان کا افسانہ ''گیت کے چار بول'' جس کا بنیادی موضوع حسن وعشق ہے۔اس میں کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی بھی پیش کی ہے۔''گیت کے چار بول'' جذبات میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے۔ اس میں حسن وعشق کا اظہار اور گھٹن بھری زندگی کی تلخ حقیقت بھی۔ کیوں کہ جن لوگوں کو برسوں سے ہنسنا نصیب نہیں ہوا ہو وہ آسانی سے قہقہے بلند نہیں کر سکتے بلکہ ایسے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔افسانہ''گیت کے چار بول'' میں دکھایا گیا ہے کہ کشمیر کے غریب لوگ پہاڑوں سے برف لاتے ہیں اور شہر میں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک کشمیری لوک گیت جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

واہ یخ۔واہ یخ، ہائے کمہ ونہ وولمک یخ
اے یخ تو نعمت ہے،تو خوشی ہے، دیکھ کتنی کٹھن
چوٹیوں سے تجھے اتارا۔
''ہایخو کنہ دور گریو یخ''
سن میری یخ۔اب جو تو میرے پاس ہے میں تیرے لیے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے
بالیاں بھی بنوادوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوادوں گا۔ہائے تریشہ واوہ مورتھس یخ''
اے یخ تو ظالم بھی تو ہے،تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا
''ہائے اندری گلخو یخ''
لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے۔(2)

اس افسانہ میں پریم ناتھ درنے کشمیر کے غریبوں کی ترجمانی کی ہے جو قاری کے دل پر تاثر پیدا کرتی ہیں۔کشمیر کی غریب عوام کو اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں پر جانا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی روزی روٹی کما سکے۔اس کے علاوہ اس افسانہ میں محبت کا قصہ بھی موجود ہے۔افسانہ کا کردار''سجان'' دل ہی دل میں عزیزہ سے محبت کرتا ہے۔اس کو عزیزہ کے گالو کی سرخی اچھی لگتی ہے۔سجان دن بھر برف بیچتا ہے شام کو عزیزہ سے ملتا تو دن بھر میں پیش آئے واقعات اسے بتاتا۔سجان جب برف بیچتا ہوا عزیزہ کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہے تو دنیا سے بے خبر ہو کر خود کو عزیزہ میں گم اور عزیزہ کو اپنے میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔عزیزہ

اور سجان کی محبت میں سب سے متاثر کن چیز سجان کی سادگی ہے۔اس سادگی کی وجہ سے ایک دن سجان یہ بھی بتا گیا کہ اس کے سر پر کھجلی ہونے کی وجہ سے ایک پنجابن نے اس کی برف خریدنے سے انکار کر دیا۔اس پنجابن نے اس سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ مذاق میں اس کے سر کی کھجلی کو چاندی کہا۔ یہ بات سننے کے بعد عزیزہ اور اس کا باپ دونوں اس پر ہنستے ہیں۔عزیزہ کی ہنسی کے لیے وہ کتنی ہی کہانیاں سناتا تھا۔مگر یہ ہنسی جو عزیزہ اس کے سر کی چاندی پر ہنسی تھی۔ یہ سجان کے لیے جان لیوا تھی۔آخر میں عزیزہ کی اس ہنسی نے سجان کو عزیزہ سے دور کر دیا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

> سجان ایک نئی طاقت کے دھکے سے کھڑا ہوا اور شہر کی سرحد کی طرف دوڑا جہاں اسے اس دن کی برف خریدنی تھی...لیکن سجان سب کچھ کھو چکا تھا۔اس دن سے اس کی ایک بھی کہانی نہ سنی گئی۔اس کے آتے ہی عزیزہ کا باپ چاندی کو لے کر بیٹھتا۔ اسے چاندی کے ناموں سے پکارتا۔ پکار کے ہنستا اور عزیزہ بھی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔عزیزہ کے قہقہے اس وقت اور تیز ہو جاتے جب سجان کے ہاتھ خود بخود پگڑی کی طرف جاتے۔ جب پگڑی کی تہیں نیچے آنے لگتیں یا جب وہ اس کی طرف تعجب میں آنکھیں کھولتا یا جب وہ سچی سی بات کہہ دیتا کہ عزیزہ تیری یہ ہنسی اپنی نہیں، یہ تیرے باپ کی ہنسی ہے جو تم میں گونجتی ہے۔(3)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے سجان کی محنت مزدوری اور عشق میں ناکامی کو دکھایا ہے۔سجان کشمیری معاشرے کے غریب طبقے کا ترجمان ہے۔اس افسانے میں کشمیریوں کے استحصال اور محرومیوں کا بھی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانوں میں مناظر فطرت کی عکاسی کم پائی جاتی ہے لیکن اپنے افسانہ ''نیلی آنکھیں'' میں ڈل جھیل کی منظر نگاری کی ہے اور اس کے علاوہ انھوں نے اس جھیل میں پیدا ہونے والا پھل ''کینہ بوب'' کا ذکر بھی کیا ہے۔اس اقتباس میں ڈل کی عکاسی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ:

> یوں تو آسمان صاف تھا جیسے ڈل میں اتر کر منہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا گیا ہو اور لگتا بھی تھا کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے کیوں کہ دیکھتا ہوا آدمی اس وقت نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی۔ اتنی ہوا سے ہی پانی کے ہموار پھیلاؤ میں سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اور اضطراب کی سفید چمک میں بھی نیلاہٹ کی گہرائی ابھرتی تھی۔(4)

پریم ناتھ در کینہ بوب پھل کے حوالے سے اپنے افسانوی مجموعہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> کشمیر کا ایک لفظ ہے ''کینہ بوب'' یہ ایک کشمیری پھل کا نام ہے۔ جس کا ڈنٹھل جھیل کے پانی میں سے اوپر اٹھتا ہے ڈنٹھل کے سر پر ایک گول آنکھ کے ڈھیلے جتنا پھل ''کینہ بوب'' لگتا ہے میں نے ادھر میدانی جھیلوں میں نہیں دیکھا ہے نہ اس کا کوئی میدانی نام ہے۔(5)

کشمیر اپنی خوبصورتی کے لیے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ خوبصورتی کے علاوہ اپنے کھانوں اور میووں کے لیے بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ پریم ناتھ در نے اپنے افسانہ ''کوفتہ'' میں کشمیر کے سالنوں اور کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ ''کوفتہ'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک سالن کا نام ہے۔ در نے اس افسانے میں کشمیری خواتین اور باورچیوں کے ذریعے پکائے جانے والے مختلف اقسام کے کوفتوں کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

> بڑی محنت سے بنائی جاتی ہیں یہ خوبانیاں لالہ۔ پہلے چھری سے ہی بہت باریک کٹوایئے، پھر مٹھی بھر چھولے کی دال۔ مقدار کے بادام پستے چلغوزے اور مسالے اس میں خوب ملا۔ ابالیے ابالتے جایئے یہاں تک کہ خوب گل جائے پھر اس تمام کو رگڑ رگڑ کر چٹنی سے بنایئے پھر اس میں گھی اور دہی ملایئے پھر وہ ہاتھ ہوں لالہ خوبانیاں ڈھالنے کی۔ گھی میں اس رنگ تک تلنے کے پھر شیرہ اور کشمیری مسالوں میں ان گولیوں کا دم کیجئے سنتے ہو لالہ اس میں کیسر پڑتا ہے، کیوڑہ، دارچینی،

الا یچی، لالہ لہسن پیاز کا تو کشمیری کھانوں میں دخل ہی نہیں۔(6)

اقتباس ہذا میں کشمیری کھانوں اور مسالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ درکا افسانہ ''کوفتہ'' کھانوں اور مسالوں کے علاوہ کشمیر کی تہذیب وثقافت اور رسم و رواج کے پس منظر کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کہانی میں بہت سے کشمیری سالنوں اور کھانوں کے نام درج کیے ہیں جیسے کبرگاہ، طبق ناٹ، گوشتابہ، شفتہ، روغن وغیرہ۔ اس کے علاوہ کشمیری گبہ، پیراہن، ساوار اور کانسی کی کونڈے نما کٹوریاں جیسے ناموں کا ذکر افسانے میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

چار پائی پر ایک کشمیری گبہ تھا ان کی یہ گول پگڑی بھگت رام نے ایسی ہی پگڑی کا ایک دفعہ ذکر کیا تھا۔ پھر یہ لمبا کرتا، یہی ہوگا پیراہن کشمیریوں کا جس کی یاد جاڑے میں بھگت رام کو بہت آتی تھی پھر اسی لمحے اس کی بے چینی ختم ہوئی۔ اندر سے ایک آدمی چائے کا ساوار لے آیا۔ وہی بھاپ کی گھٹا میں نکالتا ہوا۔ الا یچی دار چینی اور سبز کی متوالی گھٹائیں وہی کشمیری ساوار اور کانس کی کونڈے نما کٹوریاں۔(7)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے کشمیری لباس اور کھانے کی دوسری چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ در کو کشمیر اور اس کی تہذیب سے جذباتی لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ ان کے افسانوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ان کے افسانے زندگی کے حقائق اور سماجی مسائل پر مبنی ہیں۔ ان سبھی افسانوں میں کشمیر سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ رہن سہن، بول چال، زیورات و پوشاک، اخلاقی اقدار، انداز فکر، توہمات غرض کہ ہر گوشے پر انھوں نے نگاہ ڈالی ہے۔ ساتھ ہی کشمیر کی نسل در نسل کی غلامی کی طرف بھی اشارے کیے ہیں کہ کس طرح کشمیری عوام کو نسل در نسل غلامی کی زنجیروں نے گھیر رکھا ہے۔ اور کشمیر کے جفاکش لوگ اپنا پیٹ پالنے کے لیے کن کن مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ افسانہ ''چڑھاوا'' کے ایک اقتباس کا منظر ملاحظہ ہوں:

قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی

> نسوار کے لیے فرنگیوں سے ایک خوبصورت سی خالی شیشی مانگ لائے گا۔ اب جو فرنگی اسے موت کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے تھے بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی؟ نسوار ہی اب اسے کون دیتا؟ وہ اب کھاتی ہی کہاں سے؟ کچھ ولی کے ڈر سے وہ رونے کی آواز کو گھونٹتا رہا۔ کچھ اس کا وہ غصہ آنسوؤں کو جلاتا رہا جو اس کو اپنی بیوی نوری پر آ رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر نوری اسے کوستی رہتی تھی۔ اب وہ کوسنے سچے ہو رہے تھے.... سچے ہو رہے تھے۔ میری خبر سنتے ہی نوری غفار کو بلائے گی اور اس کے ساتھ دوسرا بیاہ کر لے گی...وہ رنج اور غصے کی دو کیفیت کو اپنے دائیں بائیں پیروں کے ساتھ ساتھ اٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا۔(8)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے قلیوں کے سفر کو بیان کیا ہے۔ چار قلی جو فرنگیوں کے ساتھ برفباری کے دوران پہاڑ کا سفر کرتے ہیں۔ در نے کشمیر کی افلاس، غریبی، بے کاری اور بے روزگاری کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے یہ موضوعات کشمیر کے حسن پر فوقیت رکھتے ہیں۔ پریم ناتھ در کے یہاں ایسے افسانے بھی ہیں جو ''زمانی'' اور زمینی حصاروں میں محدود نہیں ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے مختلف رنگوں کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے جن میں افسانہ ''کھڑکی' بھی شامل ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے کشمیر کی عورتوں کو موضوع بنایا ہے۔ افسانے میں کانتا نام کی عورت کے ذریعے پورے کشمیری معاشرے کی عورتوں کی عکاسی کی ہے جو ریاست سے باہر اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے آتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں افسانہ ''کھڑکی'' کا یہ اقتباس:

> اندر کے وہی پتھر کے کوئلے کا دھواں ہوتا جس نے کشمیر سے آتی ہوئی دلہن کانتا جی کا دہلی میں پہلا استقبال کیا تھا۔ نئی زندگی کے اس نئے دھوئیں کو وہ تب کیا سمجھتی۔ دھوئیں سے پہلے وہ ایک ایک لکڑی کو خوشبو سے پہچان لیتی ''بدبو''، ''بید''، ''کائرؔ''، ''ہتب'' دیودار ایک ایک لکڑی جنگل کی مستی سے اپنی اپنی لہر لے کے آتی تھی۔ پھر وہ دھواں سنہری لپٹوں کے اوپر پیچ دار لکیریں بناتا۔ نہ جانے کن پریوں کی سیڑھی بناتا۔ اوپر ہی اوپر چلا جانا اور یہ جلے بھنے پتھر کا دھواں اپنی کڑواہٹ اور

> دھک کو لے کر سینے سے نیچے بھی چلا جاتا اور اندر اندر ہی پھیل جاتا۔ دہلی میں پتھر کا
> بھی ایسا کالا کوئلہ ہو جاتا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔(9)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے کانتا نام کی کشمیری عورت کی زندگی کو پیش کیا ہے جو کشمیر سے دور نئی دہلی میں آتی ہے۔ جہاں اسے سب کچھ عجیب لگتا ہے۔ دہلی کے اس ماحول میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا سمجھتی ہے۔ در نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے برفیلے پہاڑوں، سدا بہار جنگلوں، گہری گھاٹیوں اور نیلی آنکھوں والی دوشیزاؤں کی خوبصورتی کے ذکر سے گریز کیا جن کے ساتھ خیالی رومانی دنیا کے قصیدے باندھ کر دوسرے افسانہ نگاروں نے یہاں کے اصل موضوع کی توہین کی۔ پریم ناتھ در کے فکشن میں کشمیر کے جس عہد کی عکاسی ملتی ہے وہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کا عہد ہے۔ اس عہد میں عوام پر حکومت کے مظالم عروج پر تھے جس کو موقع ہاتھ لگتا وہ عوام پر ظلم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ کشمیر کے لوگوں کو اپنے استحصال کا احساس ضرور تھا لیکن وہ منظّم نہیں تھے اس لیے وہ خوف کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کشمیری عوام صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی غلامی کے عادی ہو چکے تھے۔

کشمیری عوام کے اذہان وقلوب یہ قبول کر چکے تھے کہ ان کا فرض ظلم سہنا حکومت اور امیر طبقہ کی غلامی کرنا ہے۔ پریم ناتھ در نے اس دکھ بھری زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ در کے افسانوں کے حوالے سے پروفیسر منصور احمد منصور لکھتے ہیں کہ:

> در کشمیر کے ان پھولوں کو نہیں بھولے جو باغوں میں نہیں بلکہ گھروں میں کھلتے ہیں...
> ان کے یہاں جھیل ڈل کی سطح کا سکون اور برفانی چوٹیوں کی خوش کن ہوائیں کم نظر
> آتی ہیں بلکہ ڈل کی لہروں کا انسانی جذبات سے ہم آہنگ ہونے والا تلاطم یہاں
> کے پھولوں سے مماثل انسانی زندگی کے کراہتے ہوئے زخم زیادہ ملتے ہیں۔(10)

پریم ناتھ در اپنے ڈراما ''زی گبڑ'' کے پیش لفظ میں اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ کشمیری زبان میں بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن انھیں ماحول ایسا ملا کہ جس کے باعث انھیں اظہار کے لیے دوسری زبانوں کا

سہارالیناپڑا۔اپنی اردو کہانیوں کے متعلق اپنے ڈراما کے صفحہ نمبر 4 پر لکھتے ہیں کہ:

یہ حقیقت ہے کہ میری کہانیوں کی بڑی تحسین ہوئی۔اردو میں مگر سچ بات تو یہ ہے کہ جو کچھ میں لکھتا تھا اس میں کشمیر کا مٹھاس تھا۔دوسری زبان کے الفاظ میں غیر شعوری طور پر آبشاروں کی چھینٹیں اڑتی تھیں۔ پہاڑوں کی گودیوں میں مویشیوں کے ریوڑ اچھلتے کودتے دیواروں کے بیچ میں برف کے گولے مچلتے ہوئے آ گرتے ''زی گبر''ڈل کی سطح آب پر تیرتے ہوئے کھیت رقص کرتے اوراسی عمل میں میری تحریراپنی شیرینی جذب کرتی ہے۔(11)

زندگی کی حقیقی تفسیریں:

پریم ناتھ در نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کے یہاں بھی وہی موضوعات تھے جو دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں تھے لیکن اپنے اسلوب کی وجہ سے انھوں نے اپنی الگ پہچان بنائی۔انھوں نے دوسرے افسانہ نگاروں کے برعکس بہت کم لکھا لیکن جتنا بھی لکھا سوچ سمجھ کر اور مستند لکھا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں اجتماعیت نہیں بلکہ انفرادیت پر زور دیا ہے۔اوران کے زیادہ تر افسانوں میں یہ ہی انفرادیت پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنی کہانی کے ایک کردار کے ذریعہ پورے معاشرے کی حقیقت سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے کسی ایک شخص کی زندگی کو پیش کیا تو پورا افسانہ اسی کے اردگرد گھومتا ہے جیسے کہ ان کا افسانہ'' کاغذ کا واسدیو'' جس میں شروع سے لے کر آخر تک واسدیو ہی متحرک دکھائی دے گا۔اس میں واسدیو کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔افسانے کا کردار واسدیو اپنی بیوی کی وفات کے بعد اپنے بچوں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے تا کہ ان کو اپنی ماں کی کمی کا احساس نہ ہو۔وہ اپنے بچوں کو ہر وقت ہنساتا رہتا ہے۔کبھی ان کو جانوروں کی آوازیں نکال کر ہنساتا ہے تو کبھی ان کو خوش رکھنے کے لیے اچھی اچھی کہانیاں سناتا ہے۔آخر کار برف کا موسم آتا ہے واسدیو پھر بھی اپنے بچوں کو الگ الگ کھیل دکھاتا ہے جب اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اس کی زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ پھر بھی اسے صرف اپنے بچوں کی خوشی کی فکر ہوتی ہے۔ پریم ناتھ در نے اس

افسانے میں ایک ایسے باپ کو پیش کیا ہے جو اپنے دونوں بچوں تلسی اور موہن کی خوشی کی خاطر اپنی آخری سانسیں بھی ان کی مسکراہٹ کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے بچوں کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ موت کے قریب ہے۔ در اپنی کہانی کے کردار کی نفسیاتی اور داخلی کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں ایسی ہی نفسیاتی کیفیتوں کا اظہار ہے۔ انھوں نے کسی سماجی کمزوری کو پیش نہیں کیا بلکہ انفرادی یا شخصی خوبی اور خامی کو ابھارا۔ اس کی بہترین مثال افسانہ ''دنوں کا پھیر'' ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار پھول دئی ہے جو اپنی دوکان کے سامنے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر چند منٹ کے لیے اپنی پرانی زندگی میں لوٹ جاتی ہے۔ جہاں اس کا پیار کرنے والا شوہر تھا۔ اس کی وفات کے بعد کئی لوگوں نے اس پر ڈورے ڈالے پر پھول دئی نے کسی کو بھاؤ نہیں دیا تھا۔ صرف ایک مکندی کے علاوہ جو اس کی دوکان کے لیے سودا لاتا تھا۔ اور اس کی بہت مدد کرتا تھا۔ اسی حالت میں اس نے اپنے چھوٹے گھنشام کو پال کر بڑا کیا تھا جو آج اس دوکان کا مالک ہے اور اس کا کاروبار اب بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس نے کاروبار سنبھالتے ہی مکندی کو اپنے گھر سے نکال دیا جو برسوں سے پھول دئی کے ساتھ رہتا تھا اور اب وہ اپنی ماں کو بھی ڈانٹتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> ایک دن پھول دئی اپنے بیٹے کی دوکان کے سامنے بھیڑ کو دیکھتی ہے۔ پھول دئی نے اس سے پہلے اتنی بھیڑ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بھیڑ میں کچھ گاہک پرانے تھے اور کچھ نئے۔ پھول دئی ان سب کے بیچ میں راستہ بناتی ہوئی دوکان میں پہنچ جاتی ہے۔ اسے وہاں دیکھ کر گھنشام کہتا ہے۔ ''ری تو کاہے آئی...تو بھی چینی لین کو آئی کیا۔'' ری بولے کیوں نا؟ میرا منہ تکے جائے بڑیا....کاہے آئی تو؟(12)

یہ افسانہ ایک بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے گھنشام کے درمیان کے رشتے کی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے کہ کیسے ایک بیٹا اپنی ماں کو اسی دوکان سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے جو کبھی اس کی محنت اور قربانیوں سے بنی تھی۔ بیٹے کے اس تلخ بھرے رویے سے غم زدہ ماں کو ماضی کے وہ تمام حالات یاد آتے ہیں جن سے گزر کر اس نے بیٹے کی پرورش کی تھی اور کاروبار جمع کیا تھا۔ پریم ناتھ در نے اس افسانے کے ذریعہ سے قارئین کو یہ محسوس

کرانے کی کوشش کی ہے کہ ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش اور خوشی کے لیے ہر طرح کے دکھ اٹھاتی ہے۔ مگر بچے بڑے ہو کر ماں کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے بجائے اسے دکھ دیتے ہیں اور ذلیل کرتے ہیں۔ پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں میں سماج کے ان گوشوں پر نظر ڈالی ہے جس سے اکثر لوگ گریز کرتے ہیں۔ در نے خود ہندو ہوتے ہوئے بھی ہندو مذہب میں پنڈت، مہنتوں اور برہمچاریوں کے غلط کاموں پر سے پردہ اٹھایا ہے کچھ لوگوں کو ہر سماج میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور برے کاموں سے پاک مانا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ افسانہ ''تحلیل نفسی'' میں در نے پنڈت، مہنتوں اور برہمچاریوں کے داغ دار چہروں سے نقاب اٹھایا ہے۔ اس افسانہ کا واقعہ ایسے شخص کی زبانی بیان کیا ہے جو بدری اور اس کے باپ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ اسے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ یعنی تحلیل نفسی کرنے کا شوق ہے۔ اسی شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک ڈائری بنا رکھی ہے۔ جسے وہ ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا ہے اور ان افرادوں کی ذہنی کیفیت کو نوٹ کرتا ہے جن سے اس کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ تحلیل نفسی کے اس شوقین کو افسانے کا ایک کردار بنا کر پریم ناتھ در نے کتابی علم اور اصل زندگی میں پیش آنے والے حقیقی واقعات کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ بدری کے والد بابو جی کو ملازمت سے ریٹائر ہوتے ہی یہ خیال آتا ہے کہ ملک کے متبرک مندروں کے درشن اور متبرک مقاموں کی یاترا کی جائے۔ افسانے کا ایک اہم کردار ''بھارگو'' نامی شخص ہے جو بدری کے دفتر میں ملازم ہے جو بعد میں برہمچاری ہو جاتا ہے اور مندروں میں رہتا ہے۔ درج ذیل اقتباس سے اس کہانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> برہمچاری جی تخت پر لیٹ رہے تھے لیکن ابھی ان کی بڑی بڑی آنکھیں گھوم رہی تھیں اور تینوں عورتوں کی ممنون نگاہوں کو روشن کیے جا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک ان کے سرہانے پنکھا جھل رہی تھی وہ سب میں چھوٹی تھی اور اس کی نظر میں حیا میں انہی کے ماتھے کی طرف جھکی ہوئی تھیں جو دو اور تھیں پاس بیٹھے ان کے پیروں کو دبا رہی تھیں۔ جب ان دو عورتوں نے مجھ پر دلیری سے نظریں گاڑ دیں اور گیروی دھوتی کو ہٹا ہٹا کے پنڈلیوں کو پکڑ پکڑ کے دباتی رہیں اور میری طرف بار بار نظریں اٹھاتی رہیں۔ میں بدری کو یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ جو بظاہر دکھا رہی ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں

> کرتے، دراصل شرم کے مارے منھ چھپانا چاہتی ہیں۔لیکن جب میں بدری کی امید میں پیچھے مڑا میں نے دیکھا کہ بدری کمرے میں گھسا ہی نہیں تھا۔(13)

ہندو معاشرے میں جو رنگا رنگی اور چہل پہل نظر آتی ہے اور جس قسم کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ان رسومات میں سے کچھ کی نوعیت مذہبی ہوتی ہے اور کچھ کی خالصتاً تہذیبی وثقافتی ہوتی ہے۔ پریم ناتھ در خود ہندو تھے اس لیے ہندو معاشرے میں پائی جانے والی رسموں اور رواجوں سے ان کی اچھی واقفیت تھی۔ پریم ناتھ در کی شخصیت کے دو پہلو نظر آتے ہیں ایک تو وہ جو ترقی پسند تھے ان کے سینے میں آگ کا ایک سمندر چھپا تھا۔اور اپنے افسانوں میں انسان کے درد کی دکھ بھری کہانی کو پیش کرتے تھے۔اور دوسرا معاشرے میں غلط رسم و رواج کے پابند نہیں تھے۔انھیں معاشرے میں جو رسم اچھی لگی اس کو اپنایا۔اور جو اچھی نہیں لگی اس پر سے طنز کیا۔اس حوالے سے مرحوم شمیم احمد شمیم لکھتے ہیں کہ:

> درصاحب بڑے مذہبی آدمے تھی۔ان کے دل میں بھگوان کا خوف تھا اور انسان کی محبت وہ پوجا پاٹھ بھی کرتے تھے اور پیروں فقیروں کو بھی مانتے تھے۔لیکن ان کی مذہبیت میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں تھا کہ جو عام طور پر کٹر ہندوؤں یا کٹر ملاؤں میں ہوتا ہے۔وہ ذہنی طور پر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی سماجی اعتبار سے رسم ورواج کے سخت پابند تھے۔(14)

پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں میں گھریلو زندگی کے ان پہلو کو بھی اجاگر کیا، جن سے اکثر رشتوں میں کھٹاس پیدا ہوتی ہے۔ایسا ہی افسانہ ''غلط فہمی'' ہے۔اس افسانے کی کہانی تپ دق کے مریض رام سرن، اس کی بیوی بملا اور افسانہ کے راوی کے اردگرد گھومتی ہے۔راوی اپنی بیوی کے ساتھ دہلی میں رہتا ہے اور اس کی بیوی کو چھوٹی بہن ''بملا'' اپنے شوہر کے ساتھ پٹیالہ میں رہتی ہے۔ بملا راوی کو یہ خط لکھ کر اطلاع دیتی ہے کہ رام سرن تپ دق کے مریض میں مبتلا ہے۔خط پڑھنے کے بعد راوی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ رام سرن کا علاج کروائے گا اور رام سرن اور بملا کو پٹیالہ سے شملہ لے آتا ہے۔علاج کے لیے رام سرن کو بملا پر شک ہوتا ہے کہ

اس کا چکر کسی لڑکے کے ساتھ ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> اس نے مجھ سے جھوٹ بولا بھیا جی۔ وہ ہر روز وہی جھوٹ دہراتی گئی۔ ڈھائی سال میری زندگی اجیرن رہی ڈھائی سال... پھر اس روگ نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے زندگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں زندگی سے ڈرتا تھا مجھے کھانسیوں اور بخاروں نے زندگی کی تھپیڑوں سے بچائے رکھا... تم منھ کیوں بنا رہے ہو بھیا جی؟ میں دیوانہ نہیں ہوں تم نے سنا نہیں کہ آدمی تپ دق میں آخری لمحے تک ہوش نہیں کھوتا۔(15)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے شوہر کی ذہنی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ اگر شوہر مرنے کے قریب بھی ہو تو اسے بیوی کی بے وفائی کا غم اپنی بیماری سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے مریض کی الجھی ہوئی ذہنیت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ اگر اسے حقیقت حال معلوم ہو جائے تو اسے سکون ملے گا اور وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ علاج کے دوران راوی اس کی بیوی سے عشق بازی کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی۔ اس کی ناکامی کا سبب وہ گنوار نوجوان ہوتا ہے جو مریض کی موت کا باعث ہوا جس کی وجہ سے مریض کو اپنی بیوی کی بے وفائی کا شک ہوا تھا۔ در نے اپنے افسانوں کے ایک ایک کردار سے سماج کے ان پہلو کو سامنے لایا جن سے ہر کوئی انجان رہتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے ''ٹروی بس'' میں ٹھاکر سنگھ نامی بس ڈرائیور کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا اور اس کی نفسیات کو جاننے کی کوشش کی۔ پریم ناتھ در نے یہ افسانہ ایسے راوی کی زبانی بیان کیا ہے جو گرمیوں میں پٹھان کوٹ سے سری نگر جا رہا ہوتا ہے۔ اس کہانی میں بھی بیوی کی بے وفائی کا غم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس غم نے ڈرائیور ٹھاکر سنگھ کو خاموش رہنے کی عادت ڈال دی ہے۔ ٹھاکر سنگھ کسی سے بات نہیں کرتا خاموشی سے بس کو تیز رفتار سے چلاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> ٹروی بس کبھی راستے میں رکی نہیں تھی کبھی پانی بھرنے دم بھر بھی ٹھہری نہ تھی کہ بیچ ٹروی بس کو بریک لگ گئی، سواریاں اچھل پڑیں اور سب نے کھڑکی سے باہر گردنیں لمبی کر کے وجہ تلاش کی ایک دبلا سا لڑکا نیلی قمیض اور خاکی ٹکر پہنے گلے میں

بستہ لٹکائے بس کے دروازے کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔(16)

اس اقتباس سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ٹھا کر سنگھ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی بیوی اس لیے بھاگی تھی کیونکہ ٹھا کر سنگھ ان پڑھ تھا۔ اس لیے ٹھا کر سنگھ اسکول کے بچوں کے لیے بس روکتا تھا تا کہ کسی اور کو ان پڑھتا کا شکار نہ ہونا پڑے۔ بس کنڈ کٹر جگجیت سنگھ نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ استاد صرف اسکول کے لڑکوں کے لیے بس کو روکتے ہیں۔ ورنہ کوئی غریب مسافر لولا لنگڑا ہو تب بھی استاد بس نہیں روکتے۔ ملاحظہ ہوں اس افسانہ کا ایک اور اقتباس:

ٹھا کر سنگھ بولا بھاگا ہمارا بیوی کسی اور کے ساتھ بھاگا۔ گھر چھوڑ کر بھاگا۔ بابو ہم کلینز تھا گاڑی کا۔ گاڑی والا مالک بیوی کو لے گیا۔(17)

در نے اس کہانی میں اسکول کے بچوں کے ذریعہ ٹھا کر سنگھ کی ایک پوشیدہ تہہ کو کھولا ہے۔ در نے افسانے کے آخری حصے میں راوی، ٹھا کر سنگھ اور بسواس موشائی کی گفتگو کے ذریعے تہہ میں چھپے اس راز کو فاش کیا ہے جس نے ٹھا کر سنگھ کو غیر متوازن ڈرائیور بنا دیا۔ پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں میں کچھ ایسی کہانیاں بھی لکھی جن میں ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس موضوع پر ان کا ایک افسانہ ''سڑے پھسے ٹماٹر'' ہے جس میں جانکی داس کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے۔ افسانہ کا قصہ کچھ یوں ہے۔ جانکی داس کا بیٹا کمار لندن میں رہتا ہے اور وہیں شادی کرتا ہے۔ جانکی داس اور اس کی بیوی کمار کی شادی کے لیے لندن جاتے ہیں۔ جہاں جانکی داس کو سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس منظر کو پریم ناتھ در نے یوں رقم طراز ہیں کہ:

رتنا نے دو قطاروں کے بیچ میں دلہے بیٹے کمار کو دیکھا اور اس کی دلہن میم کو بھی۔ بولی ہاں وہ دیکھا نظر بد دور، بیٹا کمار کتنا سجیلا لگ رہا ہے ساتھ بیٹھی ہے نا.... کیا نام ہے دلہن کا۔ جانکی داس بولا.... نام ہے جانی... بولی.. نہیں... وہ تو کمار اسے پیار سے کہتا ہے... نام کچھ اور ہے... پاس جو دیسی بیٹھا تھا۔ بولا۔ جون لالہ جی جون۔ ہاں وہی

> جون۔ جانکی داس اس نام کو دھیرے دھیرے دہراتا گیا۔ اور ہال کے ہلکے ہلکے دھویں میں کھونے لگا۔ دھویں کے ساتھ بھنتے ہوئے مرغے اور کباب کی خوشبو نہ ہوتی، جانکی ناتھ یہاں بھی کھو جاتا اور نہ جانے کہاں پہنچتا۔ لیکن سنبھل کر بھی اس کے دل کو کئی باتیں کریدنے لگیں پہلے یہی کہ سامنے مرغا پڑا ہوا ہے۔ اس کو کیسے کھاؤں، چھری کانٹا کہا اسے خیال ہوا کہ یہاں انگلیاں بھی نہیں چلیں گی۔ اس نے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ایک بار پھر دیکھا بیٹھے بٹھائے اسے پھر وہی خیال ہوا کہ کرسیوں پر رنگین بینگن، شفاف شلغم، کرارا پودینہ سب کھل رہے ہیں۔ کھلکھلا رہے ہیں اور جب کانٹوں پر کباب لہرانے لگے۔ چہروں کے رنگ ایسے ابھر آئے جیسے بینگنوں، ٹماٹروں پر سبھی نے تیل پانی کا پونچھا پھیر دیا ہو۔(18)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب کے فرق کو پیش کیا ہے۔ پریم ناتھ در نے اس کہانی میں تہذیبی و ثقافتی گوشوں پر نظر ڈالی ہے جو گوشے اکثر پوشیدہ رہتے ہیں۔ عام فکشن نگار ایسے موضوعات پر جانے سے گریز کرتے ہیں لیکن پریم ناتھ در نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے کشمیری تہذیب اور زندگی کے دوسرے درپیش مسائلوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جو عام انسان کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔ در نے اپنے افسانے ''بے تال لمحے'' اور ''ایک کوئلہ ایسا جس کے رنگ ہزار'' میں بھی عام انسانوں کی مظلوم زندگی کو بیان کیا ہے۔ ان افسانوں میں بھی استحصال اور غربت کو موضوع بنایا ہے۔

پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں میں جنسی نفسیات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ایسی کہانیوں میں ''جوان'' اور ''غلط فہمی'' شامل ہیں۔ غلط فہمی میں مختصر اشاروں میں ذکر ملتا ہے لیکن ''جوان'' میں جنسی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور قاری کو محسوس کرایا ہے کہ بانکے لال جیسی ٹیڑھی میڑھی بھٹکی ہوئی نگاہیں بھلے ہی برسوں کے تجربے کے باعث صواب کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہوں۔ مگر ان کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ بانکے لال اس افسانہ کا کردار ہے جو گھر میں بیوی ہوتے ہوئے بھی عورتوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ طنزیہ اسلوب میں لکھے گئے اس افسانے کا یہ اختتام ہے کہ گنونتی دیوی جو بانکے لال کی بیوی ہے جو اپنے آپ کو اجڑی جوانیوں والوں میں سمجھنے پر مجبور ہے۔ اس اجاڑ پن کے لیے گنونتی دیوی ماں کو ذمے دار قرار دیتی ہے۔ پریم ناتھ در نے اس

کہانی میں طنز کیا ہے۔ جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ لاعلم لوگ ہی اپنے غلط اعمال کو دیوی دیوتاؤں کے سر تھوپتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے قریب ترین افراد اصل میں اپنی غلط فہمی کے باعث محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ دیوی، دیوتا کسی کو اپنا شکار نہیں بناتے۔

حواشی:

(1) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص، 5۔

(2) ایضاً، ص، 2۔

(3) ایضاً، ص، 12۔

(4) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص، 11۔

(5) ایضاً

(6) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص، 54۔

(7) ایضاً، ص، 56۔

(8) ایضاً، ص، 98۔

(9) ایضاً، ص، 98۔

(10) پریم ناتھ در، زگبرٹ، سری نگر: اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1969ء، ص، 4۔

(11) منصور احمد منصور، موج قلم، سری نگر: میزان پبلشرز، 2011ء، ص، 163۔

(12) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص، 129۔

(13) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص، 54۔

(14) شمیم احمد شمیم، پریم ناتھ در میرا یار نمبر، روزنامہ 'آئینہ' سری نگر: 11 ستمبر 1976ء، ص، 7۔

(15) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ کالونی، 1991ء، ص، 249۔

(16) ایضاً، ص، 249۔

(17) ایضاً، ص، 252۔

(18) پریم ناتھ در، بے تال لمحے، نئی دہلی: ناولستان جامعہ نگر، 2012ء، ص، 25۔

باب سوم

پریم ناتھ در کے فکشن میں ہنگامی موضوعات

تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات ہندو پاک کی تاریخ کا وہ المیہ ہے جس نے ہر عام و خاص کو متاثر کیا۔ متاثرین میں فنکار اور ادیب بھی شامل ہیں۔ فنکار اور ادیب سماج کا حصہ ہیں اس لیے سماج میں ہونے والے واقعات کو شعرا اور ادیب اپنے قلم میں رنگ کر پیش کرتے ہیں۔ تقسیم کے موضوع پر بہت سے افسانے اور ناول لکھے گئے۔ ادھر ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں میں بھی تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ حالات رونما ہوئے۔ اس موضوع پر قدرت اللہ شہاب نے ''یا خدا'' نام سے افسانہ لکھا جس میں ان تمام واقعات کو بیان کیا۔ ''یا خدا'' کا اقتباس ملاحظہ ہوں:

> اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی... جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا.... اب تو.... خوشی محمد نے ہمہ تن ہو کر خبریں پڑھیں... کشمیر کی جنت میں بھی دوزخ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے... زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔ پھولوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے، نسیم بہار کی جگہ ڈوگروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے ہزاروں مر رہے تھے۔(1)

اس اقتباس میں صوبہ جموں میں 1947 کو رونما ہونے والے فسادات کو بیان کیا ہے۔ ان فسادات کا اثر صوبہ جموں تک ہی محدود رہا۔ صوبہ کشمیر میں اس کے برعکس قبائلیوں نے حملہ کیا۔ اس حملہ کو پریم ناتھ در نے

اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی 1965ء کی جنگ کو اور رفیوجیوں کی زندگی کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ اس سے پہلے کہ پریم ناتھ در کے افسانوں کے متعلق تفصیل سے بات کی جائے۔ 1947ء کی کشمیر کی اس صورتحال کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس سے پریم ناتھ در کے موضوعات کو سمجھنا آسان ہوگا۔

1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا۔ پورا ہندوستان ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جل رہا تھا مگر کشمیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کشمیر اپنے پرامن اور بھائی چارگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق کرانے کے لیے جب ہندوستان کے وائسرائے کشمیر میں آئے تھے اس دورے کے حوالے سے سنہا ولا بٹ لکھتے ہیں کہ:

> لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنی پہلی ملاقات میں مہاراجہ ہری سنگھ سے یہ کہا کہ اگر وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن مہاراجہ نے اس سے صاف انکار کر دیا اور کہا میں کسی بھی حالت میں پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ ہندوستان کے وائسرے نے اس پر مہاراجہ سے کہا یہ آپ کے ہاتھ میں ہے اگر آپ پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہتے تو پھر آپ کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لینا چاہیے اس صورت میں آپ کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے میں ایک ڈویژن فوج بھیجنے کے لیے تیار ہوں لیکن مہاراجہ نے جواب دیا میں ہندوستان کے ساتھ بھی الحاق نہیں کرنا چاہتا بلکہ خودمختار رہنا چاہتا ہوں۔(2)

مہاراجہ کشمیر ریاست جموں وکشمیر کو خودمختار ریاست رکھنا چاہتے تھے۔ 1947ء میں مہاتما گاندھی نے بھی کشمیر کا دورہ کیا لیکن مہاراجہ نے اپنے الحاق کی کوئی رائے نہیں دی۔ ادھر برصغیر میں جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو وہ بٹوارہ ہندو مسلم کے خون سے رنگا ہوا تھا۔ ان فسادات سے کشمیر میں بھی سیاسی بے چینی بڑھتی گئی اس لیے مہاراجہ کی حکومت اور حکومت پاکستان کو معاہدہ کرنا پڑا۔ اس حوالے سے شیخ محمد عبداللہ اپنی کتاب ''کشمیر

ہندوستان اور پاکستان‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

> مہاراجہ کشمیر نے دونوں ملکوں کے ساتھ جوں کا توں معاہدہ (اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ) کرنے کی پیشکش کی تھی جس کی رو سے برصغیر کی آزادی اور تقسیم سے پہلے جو آئینی تعلقات بہت سے بنیادی امور اور عوامی زندگی سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں برطانوی علاقہ کے ساتھ تھے وہ جوں کے توں قائم رکھے جائیں۔اس قسم کا ایک معاہدہ پاکستان کے ساتھ طے بھی کرلیا گیا تھا جس کی وجہ سے پاکستان ڈاک اور تار کے محکموں کی حد تک ریاست جموں وکشمیر میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس نے مہاراجہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی معاہدہ طے نہ کیا۔(3)

آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں تیز رفتاری سے پیدا ہونے والی تاریخی اور سیاسی تبدیلیوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو پریشان کردیا۔اس لیے مہاراجہ ہری سنگھ کو مجبور ہوکر شیخ عبداللہ کو جیل سے باہر نکالنا پڑا۔شیخ عبداللہ ان دنوں بھدرواہ جیل میں بند تھے لیکن 14 ستمبر 1947ء کو انھیں بھدرواہ جیل سے نکال کر سری نگر کی بادامی باغ میں منتقل کیا اور وہاں سے انھیں جیل بھیج دیا گیا بعد میں 29 ستمبر 1947ء کو رہا کردیا گیا۔اپنی رہائی کے حوالے سے شیخ محمد عبداللہ ’’آتش چنار‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

> میری رہائی کے فوراً بعد کشمیر کے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا۔میری رہائی سے قبل ریاست کے بعض سرحدی علاقوں یعنی پونچھ اور صوبہ جموں کے دیگر علاقوں میں مسلمانوں اور ڈوگرہ فوج کے درمیان مسلح جھڑپیں شروع ہوگئی تھیں۔(4)

شیخ عبداللہ کی رہائی سے قبل ہی مسلم کانفرنس کے رہنما مسلم لیگ لیڈروں کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر بات کرنے کے لیے پاکستان گئے مسلم کانفرنس کا جھکاؤ پہلے سے ہی محمد علی جناح کے دوقومی نظریہ کے ساتھ تھا۔

لیکن کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس کی قیادت سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔اس لیے کشمیر میں دوقومی نظریہ پنپ نہیں سکا۔کشمیری عوام نے محمد علی جناح کے ساتھ وہی سلوک رکھا جو ملک کے دوسرے علاقوں میں مولانا آزاد اور دوسرے مسلمان کانگریسی لیڈروں نے مسلم لیگ سے رکھا تھا۔محمد علی جناح مسلم کانفرنس کو کشمیر کی حقیقی پارٹی تسلیم کرتے تھے۔اس حوالے سے شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:

> جب ہم نے کشمیر میں کشمیر چھوڑ دو' کی تحریک چلائی تو محمد علی جناح نے اس تحریک کو غنڈوں کی تحریک کا نام دیا۔(5)

ملک کا جب بٹوارہ ہوا تو ریاستوں کے الحاق کا طریقہ کار پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف تھا۔ ادھر کشمیر میں نیشنل کانفرنس نے جی۔ایم۔صادق کو اپنا نمائندہ بنا کر پاکستان بھیجا کہ وہ پاکستان کو اس بات پر رضامند کریں کہ کشمیری عوام کے حق خود مختاری کو تسلیم کر کے الحاق کے بارے میں ان کی آزادانہ رائے کا پاکستان احترام کرے۔لیکن ابھی جی۔ایم۔صادق لاہور میں نیشنل کانفرنس کا موقف تسلیم کرانے کی کوشش میں لگے ہی تھے کہ قبائلیوں کے بھیس میں پاکستان نے 22 اکتوبر 1947ء کو کشمیر پر حملہ کر دیا۔قبائلیوں کے اس حملہ سے مہاراجہ ہری سنگھ کو کشمیر چھوڑنا پڑا اور شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا ایمرجنسی ایڈمنسٹریٹر بنانا پڑا۔قبائلیوں کا یہ حملہ کشمیر کی تاریخ کا وہ دردناک لمحہ تھا جس کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ آج تک لٹکا ہوا ہے۔ 22 اکتوبر 1947ء کو ہزاروں قبائلی حملہ آور مظفر آباد میں داخل ہوئے۔قبائلیوں کے کشمیر میں داخل ہونے کے حوالے سے عتیق صدیقی اپنی کتاب ''شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم'' میں لکھتے ہیں کہ:

> 22 اکتوبر کو ہزاروں قبائلی حملہ آور کچھ پیدل کچھ بسوں میں مظفر آباد میں داخل ہوئے۔اپنے کشمیری بھائیوں کو آزادی دلانے اور ان کی مدد کرنے کے لیے یہ جوق در جوق وادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد کا یہ عمل اکثر بہت جلد پائے تکمیل کو پہنچ جاتا تھا اور ان کی بس مال سے لدی پھندی ایک یا دو دن میں واپس آجاتی تھیں تا کہ اور پٹھانوں کو لے کر پھر کشمیر لوٹیں اور اپنے مسلمان

> کشمیری بھائیوں کو آزاد کرانے کے اسی عمل کا اعادہ کرتے ہوئے بلاتفریق مذہب ہندو، مسلمان اور سکھوں کو لوٹیں۔(6)

قبائلیوں کے اس حملہ کا کشمیری عوام نے بڑی ہی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ مظفر آباد سے لے کر سری نگر تک، یوں بھی کشمیر اپنی رواداری اور بھائی چارگی کے لیے صدیوں سے جانا جاتا ہے۔ قبائلیوں نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو مہاراجہ کی فوج قبائلیوں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک نہ ٹک سکی لیکن کشمیری عوام نے اچھے سے مقابلہ کیا۔ قبائلیوں نے 22 اکتوبر کو مظفر آباد، 23 اکتوبر کو چناری اور 24 کو اوری لوٹنے کے بعد 26 کو مہورہ کے اس پاور ہاؤس کو برباد کر دیا جو سری نگر شہر کو بجلی فراہم کرتا تھا۔ پھر انھوں نے بارہ مولہ کا رخ کیا۔ بارہ مولہ کے لوگوں نے بھی بلاتفریق قبایلیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بارہ مولہ کو لوٹنے کے بعد انھوں نے سری نگر کا رخ کیا۔ قبائلیوں نے مقامی آبادی کو زیر کرنے کے بعد ہر قصبے اور ہر گاؤں کے ایک ایک گھر کو لوٹا۔ قبائلی حملہ آوروں نے مظفر آباد سے سری نگر تک پہنچنے میں چھ دن لگائے۔ عتیق صدیقی قبائلیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> لوگوں کا بجا طور پر یہ خیال ہے کہ قبائلی اگر لوٹ اور غارت گری پر اپنا وقت صرف نہ کرتے تو ہندوستانی فوجوں کے سری نگر پہنچنے سے بہت قبل وہ سری نگر پہنچ جاتے اور سری نگر کے ہوائی اڈے پر ان کا قبضہ ہو جاتا تو ہندوستانی فوج کے لیے وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔(7)

قبائلیوں کے اس حملہ کو روکنے کے لیے مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان سے امداد مانگی۔ اس وقت حکومت ہند نے یہ رائے ظاہر کی کہ غیر ریاست میں اپنی افواج بھیجنا غلط قدم ہوگا، لہٰذا اگر افواج بھیجنی بھی ہے تو اس کے لیے کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ضروری ہے۔ مہاراجہ کشمیر نے اس وقت ’’Instrument of Accession‘‘ (1947ء) کے نام سے ایک تصدیق نامہ حکومت ہند کو بھیجا۔ اس دستاویز الحاق کو گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنی تحریر میں بیان کردہ شرائط کے ساتھ قبول کیا۔ لارڈ مونٹ بیٹن کی اس تحریر کردہ شرائط کو شیخ محمد عبداللہ نے اپنی کتاب میں اس طرح سے رقم کیا ہے کہ:

> یور ہائینس نے جو خاص صورت حال اپنے خط میں بیان کی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے میری گورنمنٹ نے حکومت ہند کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کے الحاق کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری گورنمنٹ کی یہ طے شدہ اور مسلسل پالیسی رہی ہے کہ جہاں کہیں کسی ریاست کے الحاق کا مسئلہ متنازعہ ہو۔ وہاں الحاق کے سوال کو اس ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہی طے ہونا چاہیے۔ اس اصول کے مطابق میری گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں جوں ہی امن وامان قائم ہو جائے اور بیرونی حملہ آوروں کو ریاست کی سرزمین سے نکال باہر کیا جائے۔ ریاست کے الحاق کا سوال ریاست کے عوام کے سامنے پیش کر کے ان کی رائے کے مطابق طے کیا جائے۔ دریں اثنا آپ نے فوجی امداد کے لیے جو اپیل کی ہے اس کے بارے میں قدم اٹھاتے ہوئے آج ہی کچھ ہندوستانی فوج کشمیر روانہ کی گئی ہے جو آپ کی ریاست کو بچانے کے لیے اور آپ کی رعایا کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کے لیے آپ کی اپنی افواج کی طرح مدد کرے گی۔(8)

ریاست جموں وکشمیر کو 1947ء میں ایسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ پریم ناتھ در نے ان ہنگامی واقعات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے کشمیر کے متعلق بہت سی کہانیاں لکھیں۔ ان کے چند افسانہ کشمیری عوام کی غریبی اور ان کی کشمکش کے متعلق ہیں جن کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کی حقیقی تفسیروں اور ہنگامی موضوعات پر انھوں نے لکھا۔

قبایلی حملے کے واقعات

پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں قبائلی حملہ کو موضوع بنا کر پیش کیا جس میں لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے۔ ہزاروں عورتوں کی عزتیں لوٹی گئیں اور بہت سے لوگوں نے اپنی جان کی قربانی دی۔ پریم ناتھ در نے ایسا ہی ایک افسانہ ''ویسے کا ویسا'' لکھا جس میں بارہ مولہ شہر کے واقعات بیان کیے ہیں۔ جب قبائلیوں نے

بارہ مولہ شہر پر حملہ کیا تھا۔اس افسانہ کا مرکزی کردار مادھو ہے جو بارہ مولہ کے سرکاری ہسپتال میں کمپونڈر،فلسفی اور بطور جذباتی انسان کے لحاظ سے پیش کیا ہے۔اس افسانے کے دوسرے ضمنی کرداروں میں ایک چھوٹی سی لڑکی منی اور پٹھان ہیں۔اس کہانی میں بارہ مولہ کے ایک گاؤں کا منظر پیش کیا ہے۔مادھو اپنے آپ کو ڈاکٹر ہی نہیں سمجھتا بلکہ فلسفی بھی سمجھتا ہے وہ جب کسی عورت کی نبض پر انگلیاں رکھتا تو اس کا اندر کا بھوکا مادھو باہر نکل آتا۔ در نے اس کردار کے ذریعہ انسان کی نفسیات کو اجاگر کیا ہے کہ جب کوئی انسان ہوس میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور جب اسی انسان کے سامنے ہزاروں عورتیں ننگی کی جاتی ہیں تو ان کے جسم کو دیکھ کر وہ اپنی سطحی سوچ پر شرمندہ ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے اس افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> اسے مردوں کے واویلا میں صاف لفظ بھی سنائی دینے لگے اور سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں کی رانیں بھی دکھائی دیں رانیں۔ بڑی بڑی جیسے زمین پر رکھی گئی تھیں جو پگڑی کے ان چیتھڑوں سے ڈھک نہ سکی تھیں جسے نہ جانے کیسے اور کون بچالایا تھا۔ مادھو نے محسوس کیا کہ ستر پوشی کی رسم بھی ختم ہوگئی ہے کیونکہ مردووں اور عورتوں کی نظروں میں اس نے ایک اتفاق دیکھا اس آفت کے ساتھ سمجھوتہ دیکھا جس نے مردوں عورتوں کو ننگا کر دیا تھا۔صحن میں کسی کا بھائی کسی کی بہن،کسی کا شوہر اور کسی کی بیوی ننگی تھی اور رشتوں ناطوں میں بھی کوئی نہ کوئی ننگا تھا۔ایک بلائے عام تھی اور مادھو نے سوچا کہ ہر عام شئے کی طرح یہ بلا بھی قابل توجہ نہ تھی اس نے بھی تجسس کو اندر اندر دبوچا ویسے ہی جیسے اس نے چیخوں کو پہلوؤں میں دبایا تھا اور وہ ننگی رانوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ بھی گری ہوئی دیوار کی اینٹیں تھیں۔لیکن اس لیے شاید کہ اسے ویسے دیکھنے کا تجربہ نہ تھا۔(9)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے قبائلیوں کا وحشی سلوک دکھایا ہے جس نے ہزاروں عورتوں کو ننگا کر کے سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا تھا اور مادھو کی نفسیات کو بھی اجاگر کیا ہے جو عورت کے جسم کا بھوکا ہوتا ہے لیکن وہی جسم جب دیکھنے کو ملتا ہے تو آنکھوں پر سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔قبائلیوں کے اس حملہ میں ہزاروں لوگ

مارے گئے۔انھوں نے کشمیریوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا کشمیر میں اس وقت خون کی ہولی کھلی جارہی تھی۔اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہوں اس افسانہ کا ایک اور اقتباس:

اپنی سڑک پر جس کے پرانے گڈھوں پر سے اس کے پاؤں اچھلتے جاتے تھے۔اب وہی اپنی سڑک اسے کاٹنے آئی۔سڑک تو وہی تھی۔اس میں اپنے گڈھے بھی تھے لیکن گڈھوں میں پانی نہیں خون تھا۔ٹٹوؤں کی لید کے ساتھ ساتھ برادری کی لاشیں بھی تھیں۔ہوا میں بارود ہی نہیں مٹی کی گھٹائیں تھیں۔مسالوں کی دھسک تھی۔ نالیوں میں تیل بہہ رہا تھا۔سڑک کے کنارے ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں دروازے اور دوکانوں کے پھٹے تھے، چاول، سیب، ٹوکریاں اور ٹین تھے۔انسانوں کے سر تھے الگ الگ ٹانگیں تھیں۔اور تیل خون اور ہلدی کی کیچڑی تھی۔کنارے کنارے مکان تو کھڑے تھے لیکن ان کی شکلیں بگڑی ہوئی تھیں۔دروازوں، دریچوں کی جگہ منہ کھلے سوراخ تھے جیسے یہ بھی چیخ چیخ کے پھٹ گئے تھے۔(10)

اس اقتباس میں پریم ناتھ درنے جلتے ہوئے کشمیر کی عکاسی کی ہے۔جہاں چاروں طرف خون ہی خون پھیلا تھا۔قبائلیوں نے کشمیر میں آکر ہندو، مسلمان اور سکھوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا۔قبائلی کشمیر کو آزاد کرانے کے مقصد سے آئے تھے لیکن کشمیر میں داخل ہوکر وہ اپنا مقصد بھول گئے اور یہاں ان کا مقصد عورتیں اور پیسہ رہ گیا جس کو پریم ناتھ درنے اپنے افسانے کی ایک سطر میں یوں پیش کیا ہے کہ:

زن لاؤزر لاؤ کافر کیدرائے زن۔(11)

قبائلیوں نے کشمیر میں ایسا کہرام مچایا تھا کہ جہاں عورتوں کو اپنے بھائیوں، رشتہ داروں اور گاؤں والوں کے درمیان ننگا ہونا پڑا تھا۔یہ ظلم کی وہ انتہا تھی جس کا کوئی جواز نہیں ملتا۔کشمیر کی تاریخ کا یہ وہ سیاہ داغ تھا جس نے کشمیر کی بھوکی، ننگی عوام کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔قبائلی جب کشمیر میں داخل ہوئے تو انھوں نے چاروں طرف

تباہی مچادی۔اس منظر کو پریم ناتھ در نے افسانہ ’’ویسے کا ویسا‘‘ کے ایک اقتباس میں یوں رقمطراز کیا ہے کہ:

> سبزہ زار اترائیاں اور چڑھائیاں سب پیلی ہو چکی تھیں۔گھڑیاں، بوریاں کپڑوں کے گھٹے تھے۔کالی میلی دیگیں تھیں بکھرا ہوا آٹا تھا پچکے ہوئے صندوق تھے۔ٹین کھنتر، اٹوائی کھٹوائی شہر بھر کی میلی تھی۔بیچ بیچ میں دھواں اٹھ رہا تھا اور دھویں کے نیچے اسکول کی کھڑکیاں کرسیاں اور میز تھے۔دھویں کے گرد مادھو نے وہی ایک جیسے قبائلی ہلتے جلتے دیکھے اسے وہ دھوئیں سے ہی اچھلتے دکھائی دیئے ہر دائرے کے پاس رائفلوں کے ڈھیر تھے اور لوہے کی مشینیں تھیں۔کوئی سیب کھا رہا تھا، کوئی دودھ کے لوٹے پی رہا تھا۔کوئی گوشت کی ثابت ران کو دھوئیں پر رکھ رکھ کر دانتوں سے پھاڑ رہا تھا۔ایک دائرے میں مٹھائی کی دکان بٹ رہی تھی اور دوسرے میں نہ جانے کس چیز کی مٹھیاں بھر بھر کر منہ میں ٹھونسی جا رہی تھیں۔چاروں طرف موٹے موٹے تھوک اچھلتے تھے۔قبائلی ہی قبائلی، لنگیاں ہی لنگیاں، داڑھیاں ہی داڑھیاں، دھواں ہی دھواں کیونکہ ہوسٹل کے کمروں سے بھی دھویں کی ان گنت لکیریں نکل رہی تھیں۔(12)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے قبائلیوں کی لوٹ مار کے منظر کو بیان کیا ہے۔قبائلیوں نے کشمیر کو اس طرح لوٹا جیسے گدھ مرے ہوئے جانور کو نوچ نوچ کر لوٹتا ہے۔

در کے افسانوں میں دردناک موضوعات کے ساتھ ساتھ اس وقت کے معاشرے کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔انھوں نے ہندو معاشرے کی جو تصویر پیش کی ہے وہ قاری پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔در نے افسانہ ’’اترائی‘‘ میں سدرشن پنڈت نام کے ایک کردار کے ذریعے پورے ہندو معاشرے کی عکاسی کی ہے۔افسانہ ’’اترائی‘‘ کا ہیرو سدرشن اپنی بیوی کے لیے پریشان ہوتا ہے کیونکہ قبائلی کشمیری عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں جن میں سدرشن پنڈت کی بیوی بھی ہوتی ہے۔سدرشن پنڈت بڑی بے صبری سے اپنی بیوی کی گھر واپسی کا انتظار کرتا ہے۔اسی دوران اس کے دماغ میں کئی خیالات آتے ہیں کہ کہیں انھوں نے اس کی بیوی کی عصمت کو

تو نہیں لوٹا۔ کہیں وہ بھرشٹ تو نہیں ہوئی۔ اس طرح کے خیالات سوچ کر سدرشن پنڈت پریشان ہوتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو خود ہی تسلی دیتا ہے۔ پیش خدمت ہے اس افسانہ کا یہ اقتباس:

> اوپر آتی ہوئی پدما نیچے ہی گرتی دکھائی دی۔ پدما کا بھیانک سر اور اس کے لہراتے ہوئے ہاتھ جیسے یہی خبر دے رہے تھے کہ پدما بھرشٹ ہو چکی ہے۔ بھرشٹ.... بھرشٹ... دیودار اور دور کی چوٹیوں سے یہی آواز آ رہی تھی اور دیوداروں کے سائے بہت لمبے ہو کر جیسے پدما پر انگلی اٹھا رہے تھے۔ پدما ہاں پدما بھرشٹ۔ لیکن گورو سدرشن نے یکا یک گردن سیدھی کی اور مٹھیاں بھینچ لیں جل تھا وایو بولتی ہوئی دنیا اس کے دانتوں کے نیچے دب گئی۔(13)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے ہندو معاشرے اس ذہنیت کی عکاسی کی ہے جہاں عورتوں کو پاک اور ناپاک کا تصور کیا جاتا ہے۔ اگر عورت کو کوئی اور چھو لیتا ہے تو اس کو ناپاک مانا جاتا ہے اور پاک کرنے کے لیے بہت سے منتروں کا جاپ کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> وہ خود پدما کو شدھ کر سکتے تھے ایکاوشیوں کے نراہار برت رکھوا کر، ماگھ ماس کے ٹھنڈے اشنانوں سے۔ پانچ بوٹیوں کے پرشاد سے جپوں سے پوجاوں سے انوشٹھانوں سے اور دن دن کی کرپاؤں سے وہ اسے پھر پوتر بنا سکتے تھے۔ ان کے پاس ایک نہیں ہزاروں مثالیں تھیں اور سب سے بڑا گائتری منتر کا مہاجاپ تھا۔(14)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے پاک ہونے کی تدبیر بتائی ہے۔ ہندوؤں میں خاص کر برہمن طبقہ میں پاک و ناپاک کا تصور پایا جاتا ہے جیسے کہ پدما جب سدرشن کے پاس پہنچتی ہے تو اس کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہی تھی۔ سدرشن پنڈت یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ پدما پاگل ہو چکی تھی اور سدرشن پنڈت کے شدھ کرنے کے اپائے اس کے دماغ میں ہی رہ گئے۔ کیوں کہ پاگل کو شدھ کرنے کا اپائے

سدرشن کے پاس بھی نہیں تھا۔ کشمیر میں جب عوام کو ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ تب بھی انھوں نے آپسی بھائی چارگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہندو، مسلم اور سکھ سبھی نے مل کر قبائلیوں کا مقابلہ کیا۔ کشمیر کی اس بھائی چارگی کو پریم ناتھ در نے اپنے افسانے ''گدھ'' میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک دیہاتی بوڑھا ان پڑھ کمہار ہوتا ہے جو اپنی بیوی راحتی بیٹے رسول پوتے خلیل اور اس کے دوستوں کبیر، رحیم، غفور کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ بوڑھا کمہار اپنے بنائے ہوئے مٹکے ہندو جمانوں کو دیتا ہے۔ ان مٹکوں سے ہندو شیوراتری کے موقع پر شیو اور پاروتی کے مجسمے بناتے ہیں اور ان کی برات نکالی جاتی ہے۔ اس برات میں آسمانی اسلامی فرشتے شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی کنیا دان اور نکاح کی رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں۔ کشمیر میں جب ہر کوئی اس ہی ماحول میں رنگا ہوا ہوتا ہے تبھی قبائلی کشمیر پر حملہ کرتے ہیں اور ہندوؤں کا پتہ پوچھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں اس افسانے کا یہ اقتباس:

> ایک قبائلی نے اس سے سوال کیا دوسرے نے رائفل تانی اور تیسرے نے اس کے فتنہ سے دو انگلیاں اٹھائیں کہ وہ جواب دے۔ سوال میں دو لفظ کشمیری میں تھے کافر؟ اس گاؤں میں کافروں کے گھر کہاں ہیں؟ وہ اب سمجھا کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اپنی برادری کی تلاش میں ہیں۔ وہ ان کی داڑھیوں کے بال بال کو دیکھنے لگا۔ یہ ہیں کافر۔ وہ جگا اور راحتی سے بھی کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہڈیوں پر لوہے کی گرفت اور سخت ہوئی اور دبائی ہوئی انگلیوں کے نیچے سے بھی اس کی آواز بھاگتی نکلی کہ گاؤں میں ایک بھی کافر نہیں۔ کافر اس کے ملک میں نہیں۔ اور جب رائفل والے نے حرکت کی اس نے تیسوں سپاروں کی قسم کھالی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا۔(15)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے کشمیری عوام کی سادگی اور بھائی چارگی کی عکاسی کی ہے۔ کشمیر میں قبائلی جب ہندو گھروں پر حملہ کرتے ہیں تو بوڑھا کمہار، کبیر، رحیم، غفور اور رسول اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے ہندو بھائیوں کو بچانے کے لیے جاتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔ در نے اس اختتام کے ذریعے قاری کو یہ محسوس کرانا چاہا ہے کہ کشمیر میں انسانیت، مخالف عناصر وہاں کے لوگوں کو اپنی ظالمانہ حرکتوں سے نہیں

دبا سکے۔لوگوں نے ایک دوسرے کے لیے اپنی جان کی قربانی دینی منظور کی لیکن پیچھے نہیں ہٹے۔

1947ء میں پورے برصغیر میں ہندو مسلم فساد ہوئے جہاں فساد نہ بھی ہوئے وہاں ہندو مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔اس دوران لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔بسوں اور ٹرینوں میں قتل عام ہوا۔ہزاروں عورتوں کو خودکشی کرنی پڑی۔کشمیر میں بھی تقریباً ایسی ہی صورتحال تھی قبائلی حملہ کے دوران۔فرق صرف اتنا تھا کہ برصغیر میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے اور کشمیر میں قبائلی ہندو اور مسلمان دونوں کے دشمن بنے ہوئے تھے۔در نے اسی قتل عام پر افسانہ ''آخ تھو'' لکھا،جس کا بنیادی موضوع قتل عام اور انسانی گوشت کا خرید و فروخت ہے۔اس افسانہ کی کہانی کی شروعات افسانہ کے راوی سے ہوتی ہے جو ایک دن مچھلی کا سالن کھا کر ایک عجیب سی کیفیت میں کھو جاتا ہے۔اس کیفیت کے دوران وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مچھلی کے منہ میں داخل ہوتا ہے۔وہاں ایک بازار ہے جہاں لمبے لمبے گوشت لٹک رہے ہوتے ہیں۔وہاں ایک گاہک گوشت کے جانور کی عمر معلوم کر رہا ہوتا ہے۔کوئی اسے کہتا ہے کہ گوشت جوان کا ہے۔یہ سن کر راوی کے منہ میں پانی آتا ہے لیکن پہلے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کس جوان کا گوشت ہے۔تبھی ایک درویش سے معلوم ہوتا ہے کہ جوان انسان کا گوشت ہے۔ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> بیٹا کیا سوچ رہے ہو آؤ میں بتا دوں۔اس گوشت کا نام ہے بڑی نعمت روز بکتا ہے لیکن آج کا گوشت اچھا ہے جوان ہے یہ گوشت کبھی کبھی ملتا ہے کیونکہ جوانوں کا شکار ذرا مشکل ہوتا ہے۔بوڑھے بچے اور مادہ تو روزہ ہی بکتے ہیں۔اور سنو تم خدا کا نام کھڑے ہو کر لیتے ہو کہ لیٹ کے لیٹنے کھڑے ہونے کی قید ہی کیا ہے صاحب۔ بس بس پھر ٹھیک ہے تم تو تیسرے قسم کے انسان نکلے نہ ادھر نہ ادھر سنو اگر تم لیٹ کے نام لینے والوں میں سے ہوتے تو تم بھی پھر جوان تھے۔درویش نے میرے گٹھے گٹھے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔پھر آج اس دوکان پر تین کی جگہ چار گوشت لٹکتے۔(16)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے 1947ء کے اس قتل عام کو بیان کیا ہے جہاں ہزاروں انسانوں کو

مارا جاتا ہے۔انسانوں کے گوشت اور جانوروں کے گوشت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔اس وقت انسان کے بند بند جدا کیے جارہے تھےاوران کی بوٹیاں بوٹیاں بنائی جارہی تھی۔ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> تھوتھوکیا کہا بھونتے ہیں۔تھوہم انسان کی بوٹی کو؟تھوتھوتھو بابا۔بابا انسان اشرف الخلوقات کائنات کے ارتقا کی آخری منزل معدنیات ونباتات وحیوانات کا افسر عالی انسان وہی جس کے سامنے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا جس کے روپ میں اوتار آئے انسان۔انسان۔(17)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے انسان کی انسانیت کو ظاہر کیا ہے جو درندگی میں بدل گئی ہوتی ہے۔

جنگی صورتحال

جموں وکشمیر کی عوام کو صدیوں سے حکمرانوں کے ہاتھوں غلامی کرنی پڑی جب شخصی حکومت کا خاتمہ ہوا تو بھی یہاں کی عوام کو سکون نہیں ملا۔آزادی کے بعد بھی یہاں کبھی پاکستان اور کبھی چین کا حملہ ہوا۔1962ء میں چین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔لیکن وہ ریاست کے ایک ہی صوبہ تک محدود تھا۔اس حملہ میں ہندوستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔نوجوان طبقہ کو زبردستی فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا جانے لگا۔ابھی ہندوستان اور ریاست کے لوگ اس حملے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ 1965ء میں پاکستان نے ہندوستان پر حملہ کیا جس کا ریاست کے لوگوں پر گہرا اثر پڑا۔ پانچ اگست 1965ء کو پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا۔ پاکستان نے یہ حملہ ریاست کے دوصوبوں پر کیا۔صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر پر پاکستان کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اکھنورا گران کے ہاتھ میں آجائے تو پوری ریاست خود ہی ان کے ہاتھوں میں آجائے گی۔چونکہ اکھنور کا ہی ایک واحد راستہ تھا جو ہندوستان کو ریاست سے جوڑتا تھا۔در نے اس حملہ کو موضوع بنا کر ''پانی کے پاس'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔افسانہ کا قصہ 1965ء کی جنگ پر منحصر ہے اور دوسرے افسانوں کی طرح مقام بھی کشمیر ہے۔افسانہ کا راوی صحافی ہے جو صرف خبریں اور تصویریں لینے کے لیے کشمیر پہنچتا ہے۔کشمیر پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے

کہ جنگ بند ہو چکی ہے۔ وہاں اسے چند فوجیوں کے ساتھ ایک کم عمر کا لڑکا ملتا ہے جس کو ایک فوجی گود میں اٹھائے چل رہا تھا اور وہ جنگ کی واردات سنا رہا تھا کہ وہ اور اس کا بھائی کھیل رہے تھے تبھی اچانک گولیاں چلی جس سے وہ دونوں بہت گھبرائے انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گھر کے لوگ کہاں چلے گئے۔ وہ وہاں سے بھاگ کر فوجیوں کے پاس پہنچتے ہیں۔ جہاں دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھی تبھی دشمن فوجی کی گولی سے ایک سپاہی کا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے اور وہ پانی مانگتا ہے۔ لڑکا پانی لانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے سپاہی اسے روکتے ہیں کہ دشمن فوجی اسے گولی سے ماردیں گے۔ ملاحظہ ہوں اسی افسانے کا ایک اور اقتباس:

> پانی لانے دو۔ دوسرا بولا باہر کوئی نہیں جائے گا۔ بولا۔ بولا۔ بولا خون کے منہ منہ گیلا کرو۔ گولی چلاؤ چلاؤ پھر پھر میں لیٹے لیٹے رونے لگا۔ میرا بھائی جور جور سے رونے لگا۔ پھر پھر خون والے شپاہی نے میرے ہاتھ میں بوتل دی۔ اور میں کھڈ سے باہر بھاگنے لگا۔ دوسرا شپاہی۔ بولا۔ رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ مرے گا۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ وہیں اور پیٹ پر چلو۔ پیٹ پر یوں یوں۔(18)

پریم ناتھ در نے اس اقتباس میں چھوٹے لڑکے کے ذریعے جنگ کی واردات بیان کی ہیں۔ جس میں سپاہیوں کی جنگ کے دوران کی صورتحال دیکھنے کو ملتی ہے۔ در نے اس افسانے میں رشتوں کا احساس بھی دلایا ہے جیسے کہ بٹوارے کے بعد بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے اور وہاں کی فوج میں بھرتی ہوئے اور بہت سے نوجوان ہندوستان کی فوج میں۔ یہ فوجی بٹوارے سے پہلے ایک دوسرے کے دوست تھے اور ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ لیکن اب وہی دوست فوجی بن کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے۔ افسانے کا کردار چھوٹا لڑکا جب دشمن فوجی کے ہاتھ میں آتا ہے تو وہاں دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ پیش خدمت ہے یہ اقتباس:

> سالا سالا دشمن کا بچہ.... سالا سالا طوطا سالا ناک طوطے جیسی سالا سالا طوطا ناک۔ بول سالے یہ طوطے کی ناک کہاں سے لایا...؟ بول۔ اب سالا بولتا کیوں نہیں۔ کس گاؤں کا ہے سالے دیکھا کہ لڑکے نے آنسو پونچھے اور کہا۔ دیکھا کہ سپاہی کی

آنکھیں چوڑی ہوگئیں۔ سالا گاؤں کہاں اس کا تو کوئلہ بھی نہیں اب؟ لیکن سالے یہ ناک کہاں سے لایا.... طوطا ناک... بدری طوطا.... بدری طوطا...؟ تیرا باپ؟ بدری طوطا تیرا باپ کہاں سے ہوگیا؟ دھواں کچھ کم ہوگیا اور سپاہی کے آنسو دکھائی دیئے۔ بدری طوطا میرا دوست تھا۔ میں اسے طوطا کہتا تھا۔ سب اسے طوطا کہتے تھے اس کی ناک ایسی تھی جیسی تمہاری ہے تب تمہاری ماں ہی نہیں تھی۔ بدری طوطا تھا اور ہم تھے۔ طوطا گلی دور پھینکتا درختوں سے اوپر اچھالتا۔ ہم کہتے طوطا اڑ گیا۔ طوطا اڑ گیا۔ اور تم... تم... تم بھی طوطے ہو بدری کے بچے۔ میرے بچے میں تیرا چاچا ہوں۔ دیکھ میرا خون بہہ رہا ہے۔'' میرے ہاتھوں میں گانٹھ لگانے کی طاقت نہیں۔ لگا دے اور دیکھ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ اٹھ نہیں سکتا۔ لیکن دشمن ہاں سے چلے گا۔ وہ دیکھ راستہ صاف ہے۔ پلٹن کی پلٹن کو اڑا دوں گا۔ میرے سب آدمی مارے گئے میں بدلہ لوں گا۔ جانتے ہو یہ کیا ہے مشین گن۔(19)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے ایک بے معنی پیغام دیا ہے جو انسانیت کا درس دیتا ہے۔ یہاں پر پریم ناتھ در نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو ملک کا دشمن ہوتا ہے لیکن اسے پھر بھی اپنے بچپن کے دوست بدری ''طوطے'' کی ناک یاد رہتی ہے۔ جب اس نے زخمی حالت میں چھوٹے لڑکے کو پکڑا تو اس کی ناک دیکھ کر اسے اپنے بچپن کے دوست بدری ''طوطے'' کی ناک یاد آتی ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔

شرنارتھیوں کی صورتحال

پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں شرنارتھیوں کی زندگی کے متعلق بھی لکھا۔ 1947ء میں انگریز ہندوستان سے تو چلے گئے لیکن جاتے جاتے ملک کے دو ٹکڑے کر کے چلے گئے کہنے کو تو ملک آزاد ہوا تھا لیکن اس وقت بہت سی ریاستیں دنگوں کی آگ میں جل رہی تھی اور لوگ ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ پاکستان سے آنے والی گاڑیوں میں ہندو اور سکھ ہوتے تھے اور ہندوستان سے جانی والی گاڑیوں میں مسلمان ہوتے تھے۔ لیکن راستے میں چند ایک کو چھوڑ کر بہت سے لوگوں کو اپنی جان کر قربانی دینی پڑتی تھی۔ اس حوالے سے کرشن چندر لکھتے ہیں کہ:

پاکستان اسپیشل پر اردو کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا قتل کرنا پاکستان سے سیکھو۔ہندوستان اسپیشل میں لکھا ہندی میں بدلہ لینا ہندوستان سے سیکھو۔(20)

1947ء کے فسادات نے انسان کو درندہ بنا دیا تھا کل جو بھائی تھا وہ اس وقت دشمن تھا پہلے جس کو بہن کہا تھا وہ اس وقت طوائف تھی دوسرے گروہ کے لوگوں کے لیے۔اس وقت آزادی کی قیمت اگر کسی کو چکانی پڑی تو وہ صرف ہجرت کرنے والوں کو۔ پریم ناتھ در نے اپنے افسانہ''نیلی بوتل'' میں ہجرت کرنے والے شرنارتھیوں کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔افسانہ''نیلی بوتل'' کی پوری کہانی''رفیو جی'' دھنی رام کے اردگرد گھومتی ہے۔دھنی رام پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آتا ہے اور یہاں دوا خانے میں مریضوں کو دوائی دینے کا کام کرتا ہے۔اس افسانے کا ایک اور کردار ڈاکٹر ہوتا ہے جس کے ساتھ دھنی رام دواخانہ میں کام کرتا ہے اوراس کے لکھے ہوئے نسخہ پڑھ کر مریضوں کو دوائی دیتا ہے۔دھنی رام اکثر اپنے خیالات میں ہی ڈوبا رہتا ہے۔کبھی وہ اپنی بیوی سیتا کے بارے میں سوچتا ہے جو پاکستان میں ہی اس سے بچھڑ گئی تھی اور کبھی ان ''رفیوجیوں'' کے بارے میں سوچتا جو اپنی طبیعت دکھانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس آتے تھے اور ڈاکٹر رجیو.جی نام سن کران رفیوجیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا کیوں کہ ڈاکٹر خود بھی رفیو.جی تھا۔دھنی رام یہ سب دیکھتا اور سوچتا کہ کاش اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ہوتی ۔ملاحظہ ہوں اس افسانہ کا یہ اقتباس:

> کاش انھوں نے اسے بھی ماردیا ہوتا جب وہ سیتا کو لیے گئے تھے۔کیوں نہیں ماردیا تھا۔انھوں نے اسے بھی؟انھیں شرم بھی نہ آتی تھی۔حیوانوں کو درندوں کو لے گئے اسے رحم بھی نہ آیا۔وہ چیختی گئی تھی لیکن دھنی رام نے اس وقت چاہا تھا کہ چیخنے کی جگہ وہ انھیں کاٹ کھائے ان پر ٹوٹ پڑے خود بھی پھر وحشی ہوجاتا۔کاٹتے مارتے دونوں اپنی عزت بچاتے چاہے جان ہی چلی جاتی لیکن سیتا نے پہل نہیں کی تھی۔(21)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے فسادات کے دوران عورتوں کے ساتھ ہوئی زور زبردستی کو سیتا کے

ذریعے پیش کیا ہے۔اس میں دھنی رام کا کردار ایک بے بس اور لاچار انسان کا کردار نظر آتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا۔فسادات کے دوران ایسے ہزاروں دھنی رام تھے جن کے سامنے ان کی عورتوں کی عزتیں لوٹی گئی اور وہ بے بس تھے۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ آزادی کے بعد ہجرت کرنے والے ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں میں تقسیم ہوئے تھے۔ ہندو شرنارتھی کہلاتے تھے اور مسلمان پناہ گزیں ''مہاجر'' مصیبت دونوں پر ایک ہی تھی لیکن ان کے نام الگ الگ کر دیئے تھے۔مسلمان مہاجروں کی بہت سی عورتیں ہندوستان میں ہی رہی تھی اور ہندو شرنارتھیوں کی بہت سی عورتیں پاکستان میں ہی رہی تھی۔ ان عورتوں کو جب بعد میں لایا جاتا تو گھر والے ان کو گھر میں ہی نہیں آنے دیتے تھے۔ دھنی رام بھی اس ہی سوچ میں رہتا تھا کہ اگر سیتا واپس آئے گی تو کیا وہ اسے قبول کرے گا۔ملاحظہ ہوں اس افسانے کا دوسرا اقتباس:

> یوں یہ گورنمنٹ کیا ہوئی جو اپنی عورتوں کو وہیں چھوڑ دے لیکن لا تو رہے تھے نکال نکال کے لیکن نکال کر انھیں رکھتے کہاں تھے؟ اس نے تو ایک بھی نہ دیکھی تھی نکالی ہوئی۔ خیر اسے یہ تو معلوم تھا کہ واپس آنے والوں کو بہت کم گھر والے گھر میں آنے دیتے ہیں۔ پہچانتے تک نہیں انھیں بھلا کیوں؟ دھنی رام کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی لوگ بڑے عجیب تھے۔ یہ رفیوجی بھی۔ رفیوجی بھی کیا ہوئے جو اپنی بیویوں بہنوں کو دوش دیں اور اپنے گھر میں نہ آنے دیں اور کہیں کہ بھگوان کے لیے کہیں دور چلی جا۔ہم برادری میں کیسے جئیں گے۔(22)

مذکورہ اقتباس میں پریم ناتھ درنے بیویوں اور بیٹیوں کو لے کر جو خیالات لوگوں میں رائج تھے اس کی ترجمانی کی ہے۔اس دوران عورتوں کی صرف عزت ہی نہیں لوٹی گئی بلکہ ان کے پاس جو زیورات تھے ان کو بھی لوٹا گیا۔اگر کسی رفیوجن عورت کے پاس زیورات ہوئے تو اسے قدرت کا کرشمہ ہی مانا جاتا تھا۔کیوں کہ اس دوران عورتوں کا صحیح سلامت ہندوستان سے پاکستان جانا اور پاکستان سے ہندوستان آنا بڑی کامیابی مانا جاتا تھا۔پیش ہے اس افسانے کا ایک اور اقتباس:

رپھوجن ذرا دیکھو تو سہی وہ ان بوتلوں سے ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوچھنے لگا۔ نک بس کڑے، ٹاپس، سونے کی چوڑیاں، رپھوجن اور آٹھ آنے لیکن بوتلیں جیسے بولنے لگیں۔ کیا ہے یہ تھوڑا سا سونا؟ لے کے کب تک اسے چاہئیں گے اور پھر عورت یہ چیزیں اسے جان سے بھی پیاری ہوتی ہیں۔ کھانے کو ملے نہ ملے یہ تو سہاگ ہوا سہاگ....ایک بوتل میں سے جیسے تیزاب اچھلا اور دھنی رام کے اندر اترنے لگا۔ اترتا گیا اور کھودتا گیا وہ بھی۔ خود وہ بھی تو کسی کا سہاگ تھا۔(23)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے سہاگن کے زیوراتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ انمول ہوتے ہیں۔ دھنی رام کو بھی عورت کے زیور دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی کا سہاگ ہے۔ شرنارتھی فسادات کے وقت ہر وہ کام کرنے پر مجبور ہوئے تھے جو انھوں نے کبھی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ عورتوں کو گھر چلانے کے لیے زیوروں کا سودا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ بیماری کا شکار ہوئے جو لوگ کبھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے وہ اب شرنارتھی کیمپوں میں رہنے کے لیے مجبور تھے۔ پریم ناتھ در نے ایسا ہی ایک افسانہ ''بیچ اندھیرے'' لکھا جس میں شرنارتھیوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ کہانی کا آغاز راوی کی گفتگو سے ہوتا ہے، جو شرنارتھیوں کے متعلق باتیں کرتا ہے۔ کبھی اپنے شرنارتھی پڑوسی پر طنز کرتا ہے اور کبھی اس کی بیوی پر آخر میں راوی اپنا ایک قصہ بیان کرتا ہے۔ جب ایک شرنارتھی کے ساتھ اس نے اس کے گھر پر ملاقات کی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ شرنارتھی کس حالت میں رہتے ہیں۔ راوی شرنارتھیوں کی مظلومیت کو دیکھنے جاتا ہے جس کو پریم ناتھ در نے اس اقتباس میں یوں رقمطراز کیا ہے کہ:

ٹھہریئے جایئے نہیں۔ سن کے جایئے کہ میں کون ہوں۔ میں غالباً آپ سے بہتر پڑھا لکھا ہوں۔ آپ سے کم بدتمیز ٹھہریئے۔ ٹھہرو ہاں میں پنجاب سے نکالے ہوؤں میں سے ہوں۔ وہاں ایک ہفتہ وار اخبار میں ملازمت کر رہا تھا۔ اخبار والا میری کھال اتارتا تھا۔ وہاں یہاں آ کے کھال اتارنے والا بھی نہ ملا۔ رہنے کو جگہ نہ ملی۔ یہاں آیا ہوں۔ ہزاروں اوروں میں ایک لیکن میں نے بیوی کے زیور بیچ

> ڈالے۔ایک تانگہ لیااوراب تک تانگہ چلاتا ہوں۔سامنے دیکھوسڑک کے پار۔وہ
> رہا میرا تانگہ اور گھوڑا۔گھوڑے کی مالش کر کے آیا ہوں اسے گھاس کھانے کومل گئی
> ہےاور مجھےاخبار پڑھنے کو۔(24)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے شرنارتھیوں کی بےبسی اورلاچاری کوپیش کیا ہے۔اس لاچاری اور بےبسی نے شرنارتھیوں کودوسرے لوگوں کے لیے تماشا بنادیا ہوتا ہے۔ہرکوئی راہ گیران پرطنزکرتا ہے۔شرنارتھی جس ذلت کی زندگی کو جیتے ہیں اسے کوئی دوسرا کیا سمجھ سکتا ہے۔پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں زندگی کے تلخ اور حقیقی پہلو پر روشنی ڈالی۔در نے کشمیر کی صورتحال کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا اور دوسرے سماجی حالات جوان کے اردگرد پروان چڑھے ان کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔

حواشی:

(1) قدرت اللہ شہاب، یاخدا، مشمولہ سرخ فیتا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1967ء،ص،54۔

(2) ثناءاللہ بٹ، کشمیر 1947ء سے 1977ء تک، کشمیر: علی محمد اینڈ سنز، 1980ء ص،27۔

(3) شیخ عبداللہ، کشمیر ہندوستان اور پاکستان، کشمیر: علی محمد اینڈ سنز، 1978ء،ص،3۔

(4) شیخ عبداللہ، آتش چنار، کشمیر: علی محمد اینڈ سنز، 1982ء،ص،523۔

(5) ایضاً،ص،432۔

(6) عتیق صدیقی، شیخ عبداللہ، کشمیراور ہم، دہلی: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، 1967ء،ص،32-31۔

(7) ایضاً،ص،34۔

(8) شیخ عبداللہ، کشمیر ہندوستان اور پاکستان،ص،5۔

(9) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء،ص،73۔

(10) ایضاً،ص،76۔

(11) ایضاً،ص،67۔

(12) ایضاً،ص،74۔

(13) ایضاً،ص،93۔

(14) ایضاً،ص،94۔

(15) ایضاً،ص،42۔

(16) پریم ناتھ در،کاغذ کا واسدیو،دہلی: راج ہنس پرکاشن،1949،ص،89۔

(17)ایضاً،ص،90۔

(18)پریم ناتھ در،چناروں کے سائے میں،کشمیر:فنکار کلچرل آرگنائزیشن159،ہاؤسنگ کالوجی،1991ء،ص،221۔

(19) ایضاً،ص،224۔

(20) فسادات کے افسانے،اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز،1999ء،ص،21۔

(21) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، کشمیر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن 159، ہاؤسنگ کالوجی، 1991ء، ص،195۔

(22) ایضاً،ص،196۔

(23) ایضاً،ص،194۔

(24) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز،1960ء،ص،113-112۔

باب چہارم

پریم ناتھ در کے افسانوں کا فن اور تکنیک

فن:

افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔افسانہ ایک آپ بیتی یا جگ بیتی ہوتا ہے جسے ایک محدود ہیئت میں ڈھال کر بیان کیا جاتا ہے۔افسانہ کو لکھنے کے لیے سب سے پہلے ایک قصہ کی ضرورت ہوتی ہے۔کہانی لکھنے والے کو قصہ کے انتخاب پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔دی انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں افسانہ کی تعریف یوں کی ہے کہ:

> Short story brief fictional prose narrative that is shorter than a novel and that usually deals with only a few characters. The Short Story is usually concerned with a single effect conveyed in only or a few significnat episodes or scenes.... The Short Story had its precedents in ancients Greek fables and brief romances, the tales of the Arabian nights. (1)

اس تعریف سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو ناول کے مقابلے میں مختصر ہوتی ہے۔اس میں چند باتوں کا وحدت تاثر کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔افسانہ کی مکمل وضاحت کے لیے

ایک اور تعریف پیش ہے کہ:

> Every Short Story must have a plot, characters, a setting and some of them have a theme a certain definite idea about life that the story is trying to put across. However stories tends to stress one of these several things. We will read some stories that stress plot, some that stress character and some that stress theme. (2)

اس تعریف میں افسانہ کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ افسانہ میں پلاٹ، کردار اور تھیم شامل ہوتے ہیں۔ افسانہ کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ کبھی کوئی افسانہ پلاٹ کا افسانہ ہوتا ہے اور کوئی کرداری افسانے ہوتے ہیں اور کوئی موضوعاتی افسانے ہوسکتے ہیں۔

افسانہ میں کہانی کہنے والے کی خوبی اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ کہانی کی بکھری ہوئی کڑیوں کے درمیانی فاصلے کو ختم کر کے ان کو یوں ملائے کہ ساری کڑیاں ایک ہی واقعہ کی صورت میں ڈھل جائیں۔ افسانہ کے موضوعات سماجی زندگی سے لیے جاتے ہیں۔ اس کا موضوع چاہیے کچھ بھی ہو، اس میں کوئی نفسیاتی نکتہ بیان ہو معاشرتی نظام کی بدعنوانیاں موضوع بنیں، سیاسی امور واضح کیے جائیں یا پھر انسان کے فطری پہلوؤں کی عکاسی ہو۔ بہرحال زندگی کا کوئی بھی مثبت و منفی پہلو افسانے کا موضوع بن سکتا ہے مگر اس صنف کی تمام کامیابی کا دارومدار اس کے فنی حسن پر ہوتا ہے کیوں کہ فنی حسن کے بغیر کوئی بھی تخلیق ادبی معیار حاصل نہیں کرسکتی۔

تکنیک:

تکنیک کی بات کریں تو تکنیک کا مسئلہ کافی اہم ہوتا ہے۔ تکنیک کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ کہانی کی تشکیل میں جس طریقے سے واقعات ڈھلتے ہیں، اس کو تکنیک کہتے ہیں۔ تکنیک کا استعمال موضوع اور مواد کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور یہ ایک افسانہ نگار کا شخصی طرز اظہار ہوتا ہے۔ اگر کسی کہانی میں تکنیک کا استعمال نہ ہوتو اچھا موضوع ہوتے ہوئے بھی کہانی کامیابی کے ساتھ پیش نہیں ہو پاتی ہے۔ اس لیے مواد اور موضوع کے

ساتھ تکنیک کا استعمال ہی کہانی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اگر مواد اور تکنیک میں تال میل نہ ہو تو اچھا مواد بھی بے جاں اور بے موقع تکنیک کا استعمال افسانے کو بے رنگ بنا دیتا ہے۔ اسی لیے ہر موضوع اور مواد کو تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے۔

ممتاز شیریں نے اردو افسانے کی تکنیک پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> تکنیک کی صحیح تعریف ذرا مشکل ہے۔ مواد، اسلوب اور ہیئت سے ایک علیحدہ صنف فن کار مواد کو اسلوب سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک مخصوص طریقے سے مشکل کرتا۔ میں ایک عام سی مثال سے ذرا اس کی وضاحت کر دیتی ہوں۔ مثلاً ایک برتن بنانے کے لیے سب سے پہلے مٹی کی ضرورت ہے۔ اسے خام مواد سمجھ لیجئے پھر اس میں رنگ ملایا جائے گا یہ ''اسلوب'' ہے پھر کاریگر مٹی اور رنگ کے اس مرکب کو اچھی طرح گوندھتا، توڑتا، مروڑتا، دباتا کھینچتا، کسی حصے کو گول، کسی کو چوکور، کسی کو لمبا، کہیں سے ابھرا اور مخصوص شکل پیدا ہونے تک اسی طرح ڈھالتا جاتا ہے۔ تکنیک کے لیے یہ ایک موٹی مثال ہے اور آخر میں جو شکل پیدا ہوتی ہے اسے ''ہیئت'' کہتے ہیں اور چیز بنتی ہے وہ افسانہ۔(3)

افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت تکنیک کے سلسلے میں جو خصوصیات بار بار سامنے آتی ہیں ان کی بنا پر افسانوں میں درج ذیل باتوں کا دھیان رکھا جاتا ہے:

(الف) فضا، تاثر یا مرکزی خیال پر توجہ دی جائے؛

(ب) کردار نگاری پر زیادہ اہمیت دی جائے؛

(ج) زمانے کے لحاظ سے کہانی، پلاٹ، کردار اور انداز بیان کا جائزہ لیا جائے گا یعنی ماضی، حال اور مستقبل؛

(د) بیانیہ انداز میں تصویر کشی کی جائے اور کہیں مکالموں سے بھی کام لیا جائے؛

(ہ) صرف کردار کی زبان و گفتگو یا مکالمے کے انداز میں افسانہ لکھا گیا ہو۔

لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ اردو افسانہ ان ہی سانچوں میں لکھا گیا ہے۔ اکثر فن اور تکنیک کے نئے نئے تجربے فن کار اپناتے رہے ہیں۔ ایسے ہی اگر پریم ناتھ در کے فن اور تکنیک کی بات کریں تو انھوں نے بھی اپنے افسانوں میں نت نئے تجربے کیے۔ اس باب میں، میں نے پریم ناتھ در کے فن اور تکنیک کے حوالے سے بات کی ہے۔ پریم ناتھ در کے فن میں استعارہ اور اساطیری تصورات کی بنیادی اہمیت ہے۔ در کے افسانوں میں کوئی واحد واقعہ محض واقعہ نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں دیکھے اور ان دیکھے واقعات کی نہ ٹوٹنے والی مسلسل کڑی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل میں چونکہ ان کا سفر تجسیم سے تخیل کی طرف، واقعہ سے حقیقت کی طرف ہوتا ہے۔

پلاٹ:

پریم ناتھ در کے افسانوں میں گہری جذباتیت رنگین تخیل کرداروں کی تحلیل اور ان کے عمل کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ ان کی کہانیاں ابتدا سے لے کر اختتام تک پلاٹ کی کہانیاں نہیں ہیں۔ پلاٹ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی کہانیاں کئی قسم کی ہیں۔ ان کے کچھ افسانوں میں چند چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جو مل کر ایک مجموعی اور گہرا اثر پیدا کرتی ہیں۔ پیش خدمت ہے افسانہ ''ٹروی بس'' سے یہ اقتباس:

> کشمیر کے اس سفر کا ایک نیا دور تھا وہ جب ہم بس لے کر آسمان پر چڑھتے دکھائی دیئے جب میلوں سڑک اپنی اونچائی سے نیچے تک حال سے دھندلے ماضی تک بل کھاتی چکراتی دکھائی دے رہی تھی، جب اپنی چال اور پہاڑ کی بے بسی میں انسان کی طاقت کا احساس ہونا لازمی تھا جب قدرت کبھی ہمیں اپنے چلمن میں لے کر لوری سی دینے لگتی تھی اور کبھی نیلے آسمان اور سبز پھیلاؤ میں لے آتی تھی۔(4)

اس اقتباس میں بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جو مل کر قاری پر گہرا اثر پیدا کرتی ہیں۔ در کے کچھ افسانوں میں پلاٹ شروع ہوتا ہے اور کسی نقش کو واضح کرنے کے بغیر غائب ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں پلاٹ کہانی پر ابتدا سے آخر تک چھایا رہتا ہے اور کبھی کہانی کے آخر میں پلاٹ کو پیچھے چھوڑ کر کسی چھپی ہوئی چیز کو ابھارتا رہتا ہے اور کہانی کے اختتام ہونے کے بعد صرف ایک کردار کی تصویر کے علاوہ اور کچھ قاری کے ذہن

میں باقی نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہوں افسانہ ''غلط فہمی'' سے یہ اقتباس:

> اس تار کی رسید نے میرے دل میں نئی دھڑکنیں پیدا کیں جن کو دبانے کے لیے میں نے اپنے دل میں ایک ڈر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بملا کا دماغ خراب ہو گیا ہے یہ جو گم صم ہو گئی ہے اس نے رام سرن کے نام تار دیا ہوگا۔ ہم نے ٹکٹیں لے لیں اور میں جلدی لوٹ آیا۔ آر کیٹریا میں گھستے ہی میں نے ایک لڑکے کو جنگل میں قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ وہی تھا جو جوان رام سرن کی کہانی کا گنوار لونڈا گوپال اب ایک ڈراؤنا جوان ہو گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے قدم ایسے اٹھتے تھے جیسے ایک ایک پیڑ کو توڑ پھینکیں گے۔ اس کے خوف ناک قدم جیسے میری ٹانگوں کو ڈرانے لگے میں وہیں گر گیا اور گوپال آگے بڑھتا چلا گیا۔ ادھر برآمدے میں سے ایک سایہ سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ یکا یک سارا جنگل بملا کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ برآمدے میں جوان نے اپنے لمبے لمبے بازوں پھیلائے اور ایک لمحے میں ان بازوؤں کی وسعت میں بملا غائب ہو گئی۔(5)

اس اقتباس میں کہانی کے چھپے ہوئے کردار گوپال کو ابھارا ہے جو کہانی کے اختتام پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پریم ناتھ درا کثر اپنے افسانوں میں پلاٹ، کردار، موضوع، ماحول اور توازن پر زور دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کا اعتراف انھوں نے 21 اگست 1971 کو ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی کے نامہ نگاروں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کیا تھا، جی۔آر۔حسرت گڈھار قمطراز ہیں کہ:

> ایک اچھی اردو کہانی میں موضوع، توازن، پلاٹ، کردار نگاری اور ماحول ہونا چاہیے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک ہی کہانی کو اہم نہیں بناتا ہے بلکہ ان کا امتزاج کہانی کی اہمیت کا متحمل یہ امتزاج مختلف عناصر کو ملانے سے عمل میں آتا ہے۔(6)

کردار

پریم ناتھ در نے اپنے کرداروں کے ذریعہ سے اوران کی رنگارنگی اورتہہ داری کے ذریعہ سے ایک بہتر روحانی اور ذہنی زندگی کی کشمکش کی ترجمانی کی۔انھوں نے اپنی کہانیوں سے کئی غیر فانی کردار دیئے ہیں۔ جن میں مادھو، دھنی رام، سبحان، عزیزہ، واسدیواور رحیم جیسے کرداروں کے نام آتے ہیں۔در کے کردار اکثر کسی الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں۔اس الجھن میں ان کے جذبات میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں جتنے کرداروں کو پیش کیا انھیں کھوکھلا ڈھانچہ بنا کر نہیں چھوڑا۔ان کا ہر کردار جب کچھ کہتا یا کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ ہوتی ہے۔ان کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کا کوئی جذباتی یا نفسیاتی جواز موجود ہوتا ہے اور یہی جذباتی ونفسیاتی جواز کہ ان کی کردار نگاری میں حقیقت نگاری کی گہرائیاں اور باریکیاں دونوں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ملاحظہ ہوں افسانہ ''نیلی بوتل'' سے یہ اقتباس:

> دھنی رام کتنا اچھا تھا۔تنگدل نہ تھا، نرم دل تھا۔وہ سیتا سے کب تنگ تھا۔اس نے سر ہلایا۔پھر ہلایا وہ اس سے کب تنگ تھا؟ کاش سیتا کو کوئی وہاں سے لے آتا۔اس کے ٹھاٹھ تھے۔پھر وہ آدمی بنتا اور آج وہ یہاں ہوتی۔رگھوجن ڈاکٹر اس کے بھی پیسے کم کرتا۔نہیں بیس اور بائیں تھیں وہ ساڑی پہننے لگتی۔الٹی مانگ نکالتی۔بنگالیوں کی طرح مانگ میں سیندور بھرتی۔(7)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے ''دھنی رام'' نام کے کردار کو الجھن میں مبتلا دکھایا ہے۔وہ اپنی بیوی کو یاد کرتا ہے جو اس سے بچھڑ گئی ہے وہ خود ہی اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔اس میں جذبات نفسیات اور الجھن سبھی پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایسے ہی افسانہ 'غلط فہمی' کے کردار رام سرن کی الجھن کو پریم ناتھ در نے بخوبی پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> نہیں، بملا کو مت بلاؤ۔مت بلاؤ، اسے مت بلاؤ۔وہ تو... ہاں اب وقت آ گیا ہے۔
> سنو بھیا جی۔میں بتا دوں گا۔ہاں ہاں۔بملا نے ہی تو مجھے...اسی نے پھر اسی کو بلاؤ

گے تم؟ بھیا جی... وہ تو بس بس کی گانٹھ ہے۔
اس نے مجھ سے جھوٹ بولا بھیا جی۔ وہ ہر روز وہی جھوٹ دہراتی گئی۔ ڈھائی سال میری زندگی اجیرن رہی۔ ڈھائی سال پھر... پھر اس روگ نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے زندگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں زندگی سے ڈرتا تھا مجھے کھانسیوں اور بخاروں نے، زندگی کے تھپیڑوں سے بچائے رکھا۔ تم منھ کیوں بنا رہے ہو بھیا جی؟ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ تم نے سنا نہیں کہ آدمی تپ دق میں آخری لمحہ تک ہوش نہیں کھوتا۔(8)

پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کو جذبات اور تخیل کے دائرے میں چلتا ہوا دکھایا ہے۔ جن میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ دیکھئے افسانہ ''کاغذ کا واسدیو'' سے یہ اقتباس:

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شاید وہ اسی دیے کو کھوج رہا تھا۔ شاید اس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا۔ اس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی اور موہن اس وقت دیکھ لیتے شاید وہ بھی ڈر جاتے لیکن اسے نیند آ گئی اور انھیں اس بھیانک ماحول سے اٹھالے گئی۔ دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ کاکا لحاف میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چشمے پر سماوار دھونے گیا ہوگا پھر موہن بھی جاگ اٹھا اور دونوں چور چور کوتوال کھیلتے ہوئے لحاف سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ اس کے سینے پر چڑھے، انھوں نے اس کے منہ کو ہلایا۔ اس کا نیا رنگ منہ کے نئے گراؤ ایک نئے جانور کے جیسے تھے، ہنسیوں کی نئی اکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل نہ ہوئی اور تلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویے درست نہیں کیے۔ باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی رونے لگی۔ کاکا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کانگری کی آگ بجھ گئی ہے لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں بھی حیرت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں

> معمول سے زیادہ کھل گئیں اور وہ ڈرنے لگی۔ ''نہیں نہیں کا کا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔'' تم اماں مت بنو کا کا۔اماں مت بنو۔اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کا کا۔اماں مت بنو کا کا۔(9)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے کہانی کے کردار تلسی اور موہن کے جذبات کو ابھارا ہے جو پہلے ہنستے ہیں اپنے والد پر لیکن بعد میں جب انھیں احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے معصوم جذباتوں کو روک نہیں پاتے۔ در کی کہانیوں کے اکثر کردار اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہیں جس سے پوری کہانی ان پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

جی۔آر۔حسرت گڈھانے م۔م۔راجندر، جنوری 1956ء 'راہی' دہلی کے شمارے میں پریم ناتھ در کے بارے میں لکھی ہوئی تحریر کو یوں رقمطراز کیا ہے کہ:

> ادب میں اچھی سمجھ بوجھ کے آدمی زیادہ نہیں ملتے۔اس لیے قدرتی طور پر در نے دوسرے ادیبوں کی توجہ جلد ہی اپنی طرف کھینچ لی۔ان ہی دنوں ان کے مستقبل اور اور ان کی عظمت کے واضح اشارے مجھے ان کے قریب لے آئے اور میں نے انھیں کہانیاں لکھتے دیکھا۔ وہ گھر کے کسی کونے میں چھپ کر، کسی تنہائی میں کہانی نہیں لکھتے۔اپنے تخت پر چوکری مارے بیٹھے ہیں۔ کاغذ پر جھکے ہیں۔کبھی آنکھ ناک مسکرائے گی اور کبھی تمام چہرہ سکڑ جائے گا۔وہ اپنے کرداروں کی خوشی اور غم میں برابر شریک ہوتے ہیں۔(11)

اسلوب

اسلوب کی بات کریں تو ہر شخص کا اسلوب الگ ہوتا ہے جیسے ایک شخص لمبائی، اونچائی، چال ڈھال میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے وہی صورت اسلوب کی بھی ہے۔ پریم ناتھ در، پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر اور قدرت اللہ شہاب سبھی افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی کہانیاں بھی الگ ہیں اور اسلوب بھی۔ پریم ناتھ در کے اسلوب کے حوالے سے بات کریں تو در کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے ان کی ہر کہانی میں انوکھی تشبیہیں ملتی

ہیں۔ان کے اسلوب کے حوالے سے جی۔آر۔حسرت۔گڈھا مجموعہ ''چناروں کے سائے میں'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

> پریم ناتھ در افسانوی دنیا کی ایک اہم شخصیت تھی ان کا اسلوب بہت شگفتہ ہے اور تحریر میں ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔کہانیوں میں نادر تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ پریم ناتھ در طبقاتی اور معاشی کشمکش سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے ان کی ہر کہانی میں ان احساسات کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ ایک حساس مصنف تھے جن کا دل کسی کے دکھ کو دیکھ کر فوراً دکھی ہو جاتا ہے۔(11)

یہاں پر جی۔آر۔حسرت گڈھا نے در کے اسلوب کی خصوصیات بیان کی ہیں جو صحیح بھی ہیں کیونکہ ان کا فنی کمال اس تاثر اور فضا کے باعث ہے جن سے ان کا افسانہ عبارت ہے۔اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے ان کے اسلوب کی سادگی اور زبان و بیان کا مناسب استعمال ذمہ دار ہے۔انھوں نے اپنے محسوسات و مشاہدات کو قاری تک پہنچانے کے لیے جو اسلوب برتا وہ منفرد ہے۔ساتھ ہی اپنے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ بھی ان کے ہم عصروں سے مختلف ہے اور جس طریقہ سے انھوں نے انسانی فطرت کا تجزیہ کیا وہ بھی اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔احتشام حسین مجموعہ '' کاغذ کا واسدیو'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

> پریم ناتھ در کا مشاہدہ نہایت باریک اور گہرا ہے۔اس لیے وہ قدم قدم پر ٹھہر کر واقعات کی تہہ میں اتر جاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس پڑھنے والے کا ذہن فلسفیانہ نہ ہوگا۔ممکن ہے وہ صبر آزما منزل میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ غور سے پڑھنے پر ان کے افسانے کے خاکے میں زندگی کا بھرپور ابھار نظر آتا ہے۔ در کی قوت متخیلہ تیز اور متجسس ہے۔اس میں بھی داخلیت ہی کی کارفرمائی ہے۔لیکن یہ داخلیت اپنے خارجی پس منظر سے الگ نہیں ہوتی۔(12)

احتشام حسین نے پریم ناتھ در کے محسوسات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں داخلیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کی عمدہ مثال افسانہ ''دنوں کا پھیر'' میں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں گھنشیام کی ماں حالات کی کشمکش کا سامنا کر کے اپنے ماضی میں لوٹ جاتی ہے۔ در کے مشاہدے کی باریکی افسانہ ''چڑھاوا'' اور ''گیت کے چار بول'' اور ''کاغذ کا واسدیو'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پریم ناتھ در نے سماج میں جو بھی دیکھا جس چیز کا مشاہدہ کیا، اس کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کو اپنی تحریر سے حسن بخشا۔ جی۔ آر۔ حسرت گڈھا نے مجموعہ ''چناروں کے سائے میں'' کے پیش لفظ میں ماہنامہ ''شعاعیں'' دہلی مارچ 1949ء کے شمارے سے پرویز صاحب کی تحریر کو رقمطراز کیا ہے کہ:

> در کے افسانوں میں حسن کا یہ تنوع خود اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ بلا کا صابر ہے۔ وہ ایک افسانہ لکھ کر اس پر چھ ماہ مسلسل غور کر سکتا ہے۔ ایک مشاطہ کی طرح وہ آرائش کی من سے آگاہ ہے اور جس طرح مشاطہ دلہن کا شب عروسی کے لیے سنگار کرتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے افسانوں کو دلہن کی طرح آراستہ کرتا ہے۔ جوش کی طرح وہ اس بات کا قائل ہے کہ خیال وہ ہوتا ہے جو انسان کو لکھنے کے لیے مجبور کر دے اور جب بھی ایسا کوئی خیال اس کے ذہن سے ٹکراتا ہے۔ وہ اسے افسانے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔(13)

در کے افسانے اپنے پلاٹ یا کرداروں کے نام سے ذہن میں زندہ نہیں رہتے بلکہ اپنے تاثر و فضا کی وجہ سے قاری پر کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اگر قاری سرسری مطالعہ سے کام نکال لینا چاہیں تو وہ فضا پیدا نہیں ہوتی اور وہ تاثر نہیں ملے گا جو افسانے کی روح ہے۔ در نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ قاری پر تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے طنز کا سہارا لیتے ہوئے قاری پر تاثر و فضا کی کیفیت پیدا کرنے کا طریقہ اپنایا ہے جس کی مثال افسانہ ''چڑھاوا''، ''گیت کے چار بول'' اور ''کاغذ کا واسدیو'' ہیں، جن میں طنز ہے۔ ان افسانوں میں غریب عوام کی استحصال کا بھیانک چہرہ پیش کیا ہے۔ زندگی کے کڑوے پن میں خوشی اور محبت کا سہارا لے کر در کے

اکثر کردار اس طنز اور تلخی سے بچنا چاہتے ہیں۔لیکن اس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا، جب تک سماج کی حالت نہ بدلے۔افسانہ ’’چڑھاوا‘‘ میں فرنگیوں پر طنز نہیں ہے بلکہ ان مزدوروں کی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے جو روزی روٹی کے لیے مجبور ہیں۔اس لیے فرنگیوں کے حکم کی تعمیل کرنا ان کا جیسے فرض بن جاتا ہے۔ان مزدوروں میں ولی اور رحمٰن کی زندگی نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔افسانہ ’’چڑھاوا‘‘ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی نسوار کے لیے فرنگیوں سے ایک خوب صورت سی خالی شیشی مانگ لائے گا۔اب جو فرنگی اسے موت کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی؟ نسوار ہی اب اسے کون دیتا؟ وہ اب کھاتی ہی کہاں سے؟ ولی جو کے ڈر سے وہ رونے کی آواز کو گھونٹتا رہا کچھ اس کا وہ غصہ آنسوؤں کو جلاتا رہا جو اس کو اپنی بیوی نوری پر آرہا تھا...ذرا ذرا سی بات پر نوری اسے کوستی رہتی تھی...اب وہ کوسنے سچے ہو رہے تھے...خبر سنتے ہی نوری غفار کو بلائے گی اور اس کے ساتھ دوسرا بیاہ کرے گی...وہ رنج اور غصے کی دو کیفیتوں کو اپنے دائیں بائیں پیروں کے ساتھ ساتھ اٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا۔(14)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے غریبی پر طنز کیا ہے جو غریب انسان کو روزی روٹی کے لیے جان کی قربانی دینے پر مجبور کر رہی ہے۔ایسے ہی ’’گیت کے چار بول‘‘ میں زندگی کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے جس میں عزیزہ کی محبت میں سبحان کا گرفتار ہونا پہاڑوں پر سے برف لانا اور شہر میں بیچنا۔عزیزہ کو اپنی دن بھر کی کہانی سنانا۔عزیزہ کی خوشی میں اپنی خوشی ڈھونڈنا ایک تلخ حقیقی زندگی کو بیان کیا ہے۔افسانہ ’’کاغذ کا واسدیو‘‘ میں بھی ایک والد کو اپنے بچوں کے لیے ان کی خوشی اور دل بہلاتے بہلاتے مر جانا۔اس افسانہ میں جذباتیت ابھر کر سامنے آتی ہے جو قاری پر تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ پریم ناتھ در کے افسانوں میں عورت، مرد اور بچے ایسے کردار بن کر سامنے آتے ہیں جیسے در انھیں دیکھتے ہیں یا دکھانا چاہتے ہیں۔ پریم ناتھ در کا داخلیت کی طرف رجحان ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اسلوب میں اشاریت اور ابہام سے کنایہ اور رمز سے کام لیتے ہیں۔اس رمزیت سے کبھی کبھی اس

فضا کی تشکیل کو اور ابھارنے میں مدد ملتی ہے جو ان کے افسانوں میں اپنی خصوصیت رکھتی ہے مثال کے طور پر افسانہ ''آخ تھو'' ہے جس کا بنیادی موضوع فرقہ فسادات ہے۔ در نے اس افسانے میں فرقہ وارانہ فسادات کی تصویر کشی کی ہے جس کو بھیانک پن، گندگی اور گھناؤنے پن کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباس:

> کوڑے میں بھون رہے ہیں بڑی نعمت کو دیکھو تو سہی۔ کھٹولوں کے پرانے اور سڑے ہوئے بان گندی اور گلی ہوئی لوریاں کالے سیاہ پونچھن ان ہی کی آگ میں بھوننا چاہتے ہیں۔ ایسی نعمت کو اور جب تعفن اٹھتا ہے۔ منہ ناک میں دامن ٹھونسنے لگتے ہیں۔ بد بو نہیں تو کیا خوشبو اٹھتی؟ آنکھیں پھاڑ کے پھر دیکھا تو وہی اپنی گلیاں تھیں، اپنی بستیاں، مچھلی کے اس پار کی۔ وہ لوتھڑے نہیں اپنے چہرے تھے۔ یہی ٹانگیں اور یہی رانیں تھیں۔ درویش نے میری تھوکیں میرے اندر ہی اتار دیں۔ میری دھڑکن دبا دی اور جب میں نے چند ایک لاشوں کو بوروں بانوں کی جگہ میزوں کتابوں میں جلتے دیکھا۔ جانے کیوں میں اس کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا تھا لیکن نہ دلا سکا، مجھ کو اس نے بے حس کر دیا تھا۔ اب میں یا تو نیچے کھائی میں یا اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔(15)

اس اقتباس میں پریم ناتھ در نے فرقہ وارانہ فسادات کو بھیانک پن گندگی اور گھناؤنے پن کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس میں رمزیت کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی رمزیت نے اس افسانہ میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

زبان:

پریم ناتھ در کی زبان اور انداز بیان ان کے سب ہم عصروں سے الگ ہے۔ ان کے افسانے کشمیر کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ مگر اس طرح نہیں جیسے کرشن چندر نے اپنے افسانوں پر کشمیر کے حسن کا رنگ چڑھایا۔ پریم ناتھ در کی زبان شاعرانہ انداز لیے ہوئے ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ تجریدی نظم لکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں افسانہ ''کاغذ کا واسدیو'' کا یہ اقتباس:

ڈھال پر اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے شاید اس لیے کہ اس کے سینے میں پہاڑ گھسنے لگے تھے یا اس لیے کہ وہاں سے دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے جس کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالا گرتا لپکتا اور بل کھاتا اس کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس پار اس کے بچے بھی شاید اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جو دیواروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا۔ کتنی پاس تھیں وہ گھاٹیاں کتنی گہری، یہ دھواں بھی اس کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم سنبھالے، آنکھیں کھولیں اور نالے کی اترائیوں کو دیکھ کر ان اونچائیوں کی طرف بھی نظر اٹھائی جہاں سے یہ پانی مچلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کان بھی کھولے، پانی پتھر پر گر کر ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن ٹکراؤ میں اس کی ہنسیاں سنیں، ٹوٹے ہوئے پانی کو لہروں میں جاتے دیکھا، آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اس کے پاؤں میں قوت سی آ گئی اور وہ بچوں کی طرح تیز قدم اٹھاتا گیا۔ نالے پر تلسی اور موہن اس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے۔ گھاٹیاں کیا وہاں خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑوں کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا لیکن اس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالا جو سامنے تھا اس کے قہقہے اٹھا لیے اور اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے، اتنے قہقہے، جیسے وہ ہنستا ہوا نالا اس کے سینے سے نکلنے لگا۔(16)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پریم ناتھ در کی زبان شاعرانہ انداز لیے ہوئے ہے لیکن اس پر تجریدی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ پریم ناتھ در کو افسانے کی تکنیک پر بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کی تکنیک کے حوالے سے برج پریمی لکھتے ہیں کہ:

پریم ناتھ در کو افسانے کی تکنیک پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے موضوعات سے قطع نظر ان کا ٹریٹمنٹ خلاقانہ بھی تھا اور ماہرانہ بھی۔ فنی اعتبار سے وہ بیدی اور منٹو کی قبیل کے افسانہ نگار تھے۔ زبان و بیان پر انھیں قدرت حاصل تھی لیکن وہ الفاظ کا خزانہ نہیں لٹاتے۔ نہایت احتیاط سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ ان میں

> معنی کی جہتیں لپٹی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں بہاؤ کا احساس نہیں ہوتا لیکن پیچیدگی بھی نہیں ملتی۔ ان کا اسلوب منفرد ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بلیغ بھی ہے اور مناسب بھی۔ در کے یہاں پلاٹ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تاثر کی وحدت کا خیال بھی رکھتے ہیں اور افسانے کو آغاز سے لے کر اختتام تک مختلف منزلوں میں سے کامیابی سے گزارنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اس سے ان کی کہانیوں میں فنی اعتبار سے جھول نہیں رہتی۔(17)

اس اقتباس میں برج پریمی نے پریم ناتھ در کے فن اور تکنیک پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور خصوصیات بیان کی ہے۔ ساتھ ہی زبان و بیان کی بھی تعریف کی ہے۔ پریم ناتھ در کی زبان و بیان پر بہت سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے جن میں عبادت بریلوی کا نام سب سے اوپر آتا ہے۔ انھوں نے پریم ناتھ در کو زبان و بیان کا خاص خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ جب پریم ناتھ در نے اپنا پہلا ''افسانہ'' غلط فہمی حلقہ ارباب ذوق کی انجمن میں پڑھا تو اس محفل میں بہت سے لوگوں نے ان کی تعریف اور بہت سے لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، جس کو حسرت گڈھا ان کے افسانوی مجموعے 'چناروں کے سائے میں' کے پیش لفظ میں یوں لکھا ہے کہ:

> اعجاز بٹالوی کا خیال تھا کہ بیان اور پلاٹ کو دیکھتے ہوئے کہانی میں بہت سی غیر ضروری تفصیلات ہیں۔ میرا جی کی نظر میں کہانی موجودہ صورت میں اچھ ہے لیکن اعجاز بٹالوی کو اس بات سے اختلاف تھا کہ افسانہ نگار نے محبت کے بارے میں جس قسم کا جذباتی اور شاعرانہ انداز رکھا ہے وہ مناسب نہیں۔ ظہور الدین کی رائے میں بیوی کی تصویر اس کہانی میں صاف نہیں تھی۔ میرا جی کا کہنا یہ تھا کہ بیوی اور گنوار نوجوان آس پاس کے کردار ہیں۔ بنیادی اور مرکزی کردار مریض کا ہے اور اسے افسانہ نگار نے بہت اچھی طرح سے اجاگر کیا ہے۔ ظہور الدین کی رائے میں کہانی کے انجام کا حصہ اور وہ حصہ جس میں تپ دق کا بیان ہے نمایاں طور پر کامیاب تھا۔ غلام عباس کی رائے میں کہانی بحیثیت مجموعی کامیاب تھی۔ البتہ عبادت بریلوی کو اعتراض تھا کہ زبان کے لحاظ سے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کی تائید بعض اور

حضرات نے بھی کی۔(18)

ان تمام اختلافات کے باوجود پریم ناتھ در نے اپنی کہانیوں کو ادبی معیار بخشا اور اپنے فن کا پرچم لہرایا۔ برج پریمی مزید ان کے افسانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> آج جب ہم جدید افسانے میں دروں بینی داخلیت اور انفرادیت کی بات کرتے ہیں۔ میرا ذہن پریم ناتھ در کے افسانوں کی ایسی ہی خصوصیات کی طرف چلا جاتا ہے۔ در ایک روایتی افسانہ نگار تھے لیکن اپنے روایتی انداز کے باوجود ان کی کہانیوں میں بار بار ایک عجیب انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت مجھے پریم ناتھ پردیسی کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔ ان کا مشاہدہ اس قدر گہرا ہے کہ وہ خارجی سطح کھرچ کھرچ کر اندر ہی اندر اپنے کردار کے باطن کے دریچوں میں جھانک لیتے ہیں اور وہاں اس کے داخلی محسوسات کا اندازہ کرتے ہیں۔ باطن اور داخل کی اس بے چینی اور بے کلی کو در نے اپنی بیشتر کہانیوں کا موضوع بنا لیا ہے۔ اس لیے بعض اوقات ان کا اظہار رمزیہ اور مبہم بن جاتا ہے اور بعض اوقات طنز کا سہارا لیتا ہے لیکن ابہام سے ان کے ابلاغ اور ترسیل کے عمل میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔(19)

پریم ناتھ در ان بدنصیب قلم کاروں میں سے ہیں جن کی جگمگاہٹ کو وقت کی گرد نے دھندلا دیا۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا وہ انتخاب ہے۔ ان کے افسانوں کے فن کو دیکھتے ہوئے اردو ادب کے معتبر و مستند ناقدین میں شمار کیے جانے والا نقاد آور نقاد احتشام حسین یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ:

> پریم ناتھ در کی افسانہ نویسی کی عمر ابھی کم ہے لیکن تخلیقی ذہن کی صلاحیتیں ابتدائی کارناموں ہی میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ در نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اردو افسانہ نگاری کے اس عظیم الشان دور میں کسی نئے افسانہ نگار کا

میدان میں آنا اور اپنی جگہ بنانا خود ایک قابل تحسین اور قابل غور بات ہے اور پریم ناتھ در وہ جگہ حاصل کر رہے ہیں۔(20)

حواشی:

(1) New Encyclopaedia Britannica Vol: 10-15 Edt. U.S.A. 1997, p. 140

(2) New Encyclopaedia Britannica Vol: 10-15 Edt. U.S.A. 1997, p. 141

(3) گوپی چند نارنگ (مرتبہ)، اردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص،46۔

(4) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ، 1991ء، ص،248۔

(5) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص،75۔

(6) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ، 1991ء، ص،16۔

(7) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء، ص،156۔

(8) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص،68۔

(9) ایضاً، ص،117-118۔

(10) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ کالونی، 1960ء، ص،19۔

(11) ایضاً، ص،19۔

(12) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص،1۔

(13) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ کالونی، 1991ء، ص،14۔

(14) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء، ص،98۔

(15) ایضاً، ص،91۔

(17) ایضاً،ص،108۔

(17) برج پریمی، کشمیر کے مضامین، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز،1989ء،ص،120۔

(18) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ کالونی،1991ء،ص،10۔

(19) ایضاً،ص،122۔

(20) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن،1949ء،پیش لفظ

حاصل کلام

میرے مقالے کا موضوع پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری ہے۔ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔جن میں ''کاغذ کا واسدیو''، ''نیلی آنکھیں'' اور ''چناروں کے سائے میں'' ہیں۔اس کے علاوہ ان کے تین افسانے ''باتال لمحے' رسالہ 'آج کل' (نئی دہلی) اگست 1964ء''ایک کوئلہ ایسا جس کے رنگ ہزار''، رسالہ 'آج کل' (نئی دہلی) افسانہ نمبر جون 1973ء اور ''سڑے پھسے ٹماٹر'' شیرازہ سری نگر نومبر 1974ء سے دستیاب ہوئے جن کو ان کے فرزند جگت پرکاش نے اکھٹا کر کے بے تال لمحے کے نام سے 2012ء میں شائع کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے چند مضامین اور ایک ڈراما بھی لکھا۔ پریم ناتھ در نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تو اس وقت ریاست جموں و کشمیر پر ڈوگروں کا اقتدار تھا۔ ریاست کے سیاسی حالات خراب تھے۔ چاروں طرف بھوک، بے روزگاری اور غربت عام تھی۔ زیادہ تر لوگ مزدور تھے ان کی آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں تھا۔کشمیر کی عوام کی غریبی، جہالت، سادہ لوحی اور مجبوری کا حکومت فائدہ اٹھاتی تھی اور ان کا استحصال کیا جاتا تھا۔اس استحصال کے خلاف شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کے عوام کو منظّم کر کے مہاراجہ کے خلاف آزادی کی جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ پریم ناتھ در کا بچپن اس ہی ماحول میں گزرا تھا۔ان کا تعلق کشمیری پنڈت گھرانے سے تھا۔ پریم ناتھ در نے کشمیر میں وہاں کے قدرتی حسن کو بھی دیکھا لیکن اس حسن کو اپنی تحریر کا حصہ نہیں بنایا۔انھوں نے کشمیر کے غریبوں کی غربت کو اپنا موضوع بنایا۔اس کے علاوہ زندگی کی حقیقی تفسیروں اور ہنگامی واردات کو اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔ پریم ناتھ در کو اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی شہرت ملی۔ جب انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ''غلط فہمی'' لکھا۔اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق اپنے عروج پر تھا۔ پریم ناتھ در جب دہلی آئے تو انھوں نے

عبادت بریلوی کے ساتھ مل کر دہلی میں حلقہ ارباب ذوق کی ایک شاخ کھولی اور وہاں ادبی محفلیں منعقد کی جانے لگیں۔ پریم ناتھ در نے یہاں سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ان کے فکشن میں غریب ومظلوم طبقہ دکھائی دیتا ہے۔ان کی کہانیوں میں ہر طرح کے کردار ملتے ہیں جن میں مزدور،مہاجر،کمہار،ڈاکٹر، برہمچاری، ساہوکار، پنڈت اورفوجی وغیرہ ہیں۔انھوں نے اپنے طنزیہ اسلوب کے ذریعے سماج اور مذہب کے ٹھیکیداروں پر کڑی چوٹ کی۔انھوں نے ذات پات،کھوکھلی مذہبیت، جنگ،قبایلی حملہ اور زندگی کے حقیقی مسائل جیسے سلگتے ہوئے موضوعات پر بھی لکھا۔انھوں نے اپنے ہنگامی موضوعات میں کشمیر کی ہراس دردناک تصویر کو دکھایا جو اس حملے کے شکار ہوئی جن میں بوڑھے، بچے، جوان اور عورتیں شامل ہیں۔کہیں عورتوں کی عزتیں لوٹی جارہی ہوتی ہے،کہیں اس کی نیلامی لگائی جارہی ہوتی ہے۔بوڑھے، بچے اور نوجوانوں کا قتل عام دکھایا جاتا ہے۔پریم ناتھ در کا شمار کشمیر کے معروف افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے پریم ناتھ پردیسی کی طرح کشمیر کی حقیقی صورتحال کو اپنا موضوع بنایا جس زمانے میں پریم ناتھ در کشمیر میں تھے اس وقت کشمیر میں ڈوگرہ شاہی نظام اپنے عروج پر تھا اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔کشمیر میں عوام کے استحصال کا سلسلہ تو بہت پرانا تھا۔ اس صورتحال کا آغاز ڈوگرہ شاہی عہد میں نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی بنیاد مغل حکومت کے خاتمے کے بعد پڑی جب افغانوں نے کشمیر پر حملہ کیا۔انھوں نے کشمیر میں قتل وغارت شروع کی جس سے لوٹ مار، چوری،عورتوں کے ساتھ عصمت دری جیسے واقعات عام ہوتے گئے۔ان واقعات سے تنگ آ کر لوگوں نے دیگر مقامات کی طرف ہجرت شروع کردی۔بعد میں جب سکھوں نے کشمیر کو فتح کیا۔انھوں نے لوگوں کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر برتاؤ کرنا شروع کیا۔اسی روایت کو ڈوگرہ حکومت نے بھی برقرار رکھا۔حکومت کے اس سلوک کے خلاف کشمیری عوام نے تحریک شروع کی۔کشمیر میں آزادی کے جدوجہد کرنے والوں کو دہلی، لاہور اور برصغیر کی دوسری ریاستوں سے حمایت ملی۔ادیبوں نے بھی ان کی حمایت کی اور اس ظلم کے خلاف انھوں نے قلم کے ذریعے اپنا احتجاج درج کرایا۔

کشمیر کے پس منظر میں لکھنے والے ادبا خواہ وہ وہاں کے مقامی ہوں یا دوسری ریاستوں سے وابستہ ہوں۔سبھی نے وہاں کے سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں پر قلم اٹھایا اور ڈوگرہ حکومت کے مظالم کے خلاف بھی

آواز بلند کی۔ پریم ناتھ در نے بھی کشمیر کے حوالے سے کئی افسانے لکھے جن میں ''گیت کے چار بول''، ''نیلی آنکھیں''، ''چڑھاوا''، ''ٹروی بس''، ''اترائی''، ''کوفتہ''، ''کاغذ کا واسدیو''، ''گدھ''، ''ویسے کا ویسا''، ''پانی کے پاس جوان'' اور'' آخ تھو'' جیسے افسانے لکھے۔ پریم ناتھ در نے کشمیر کے سماجی حالات اور ہنگامی صورتحال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انھوں نے کشمیری زبان میں ایک ڈراما ''زگبڑ'' کے نام سے لکھا جس کا رسم الخط اردو ہے۔ اس ڈراما میں انھوں نے کشمیر کی ہندو مسلم بھائی چارگی کو پیش کیا ہے۔ کشمیر صدیوں سے اپنی بھائی چارگی اور رواداری کے لیے جانا جاتا ہے۔ وقت بے وقت حکمران آتے گئے اور کشمیری عوام کا استحصال کرتے گئے لیکن کشمیری عوام نے اپنی بھائی چارگی کو نہیں چھوڑا۔ کشمیر میں مذہبی ہم آہنگی اور بھائی چارے کی بہت سی مثالیں ملتی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کے سکھ دکھ، میلوں، شادی اور تہواروں میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے جس کا ذکر پریم ناتھ در نے اپنے افسانے ''گدھ'' میں بھی کیا ہے۔ جہاں مسلمان اپنے غیر مسلمان بھائیوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں۔ پریم ناتھ در نے جس طرح سے کشمیر کے سماجی و اقتصادی حالات کا ذکر کیا اسی طرح انھوں نے زندگی کی دوسری حقیقی کشمکش کی بھی عکاسی کی جس میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے جیسے ہمارے اردگرد سانس لے رہی ہو۔ پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں ہنگامی صورتحال کی بھی عکاسی کی جس میں 1947ء کے اس وحشی منظر کو بیان کیا جس نے پوری کشمیری عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ساتھ ہی مہاجروں کی زندگی کے متعلق بھی انھوں نے لکھا۔ ان کے دو افسانے ''نیلی بوتل'' اور ''بیچ اندھیرے'' مہاجروں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک افسانہ ''پانی کے پاس'' ہندوستان اور پاکستان کے بیچ 1965ء میں ہوئی جنگ کے منظر کو بیان کرتا ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانوں میں ان کا اسلوب بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر ادیب کا اپنا اپنا اسلوب ہوتا ہے اور وہ اپنے اسلوب کی بنا پر پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح پریم ناتھ در کا بھی اپنا منفرد اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی ہے اور ان کی تحریر میں ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں تشبیہات و استعارات کی بڑی خوبصورت آمیزش ہے جو اپنے اندر جدت اور ندرت رکھتی ہیں اور یہ فرضی اور خیالی نہیں

ہوتیں بلکہ اصل زندگی کے حقیقی مشاہدے ومطالعے سے اخذ کی ہوئی ہوتی ہیں۔ پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے بہت سے مقامی الفاظ کا استعمال کیا ہے جیسے پیراہن، کشمیری گبہ، سماوار اور کانسی کی کونڈے اور کٹوریاں جیسے الفاظ کا استعمال کیا۔

پریم ناتھ در کے افسانوں میں جہاں اتنی خوبیاں ہیں وہیں ان کے افسانوں میں کئی خامیاں بھی نظر آتی ہیں جو ان کی زبان وبیان کے حوالے سے سامنے آتی ہیں، جس پر انھیں اکثر تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں مقامی الفاظ پر زور دیا جس سے ان کے ادبی معیار میں کمی آئی۔ کشمیر کے حوالے سے ان کا مشاہدہ گہرا ضرور تھا لیکن موضوع کے حوالے بھی محدودیت ملتی ہے۔ انھوں نے الگ الگ پہلو سے کشمیر کو پیش کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ تحریروں کے بعد ان ہی موضوعات کو دہرایا، جس سے ان کے افسانے یکسانیت کے شکار ہو گئے۔ افسانہ ''گدھ'' اور ''ویسے کا ویسا'' میں قبایلیوں کی لوٹ مار کو تقریباً ایک جیسا ہی بیان کیا گیا ہے۔ دونوں افسانوں میں قبایلیوں کی طرف سے قتل عام ہوتا ہے، گھر جلائے جاتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں افسانے ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

انھوں نے اپنی کہانیوں میں کشمیر کی منظر نگاری سے بھی گریز کیا۔ وہاں کی حقیقی زندگی کے متعلق تو لکھا لیکن بے منظر طریقے سے جس سے ان کی کہانیوں میں حسین مناظر کی کمی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کہانی کو قاری پر نہیں چھوڑتے، بلکہ خود ہی اس کی تشریح کرنے لگتے ہیں جیسا کہ انھوں نے افسانہ ''آخ تھو'' اور ''جوان'' میں کیا ہے۔ افسانے کے اختتام پر قاری کو سوچنے پر مجبور کرنے کے بجائے خود ہی اپنی سوچ سے آگاہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی بہت سے نقادوں نے ان کے افسانوی فن کی تعریف کی ہے۔

پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی جس خوبی سے کی ہے۔ اس کا اعتراف ریاست کے کئی نامور ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا وہ قابل تعریف ہے۔ اپنی بعض کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے وہاں کی سماجی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے اور ادب کے قاری کو ایک لازوال تحفہ عطا کیا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

در، پریم ناتھ، کاغذ کا واسدیو، دہلی: راج ہنس پرکاشن، 1949ء۔

در، پریم ناتھ، نیلی آنکھیں، دہلی: نگین پبلی کیشنز، 1960ء۔

در، پریم ناتھ، ز گبرڑ، سری نگر: اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1969ء۔

در، پریم ناتھ، چناروں کے سائے میں، سری نگر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن ہاؤسنگ کالونی، 1991ء۔

در، پریم ناتھ، بے تال لمحے، ناولستان، نئی دہلی: جامعہ نگر، 2012ء۔

ثانوی ماخذ:

احمد، انوار، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ملتان: بیکن بکس، 1988ء۔

اختر، جمیل، اشاریہ آج کل (جلد اول)، دہلی: اردو اکادمی، 1988ء۔

اختر، جمیل، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2002ء۔

اسلم، فوزیہ، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009ء۔

بٹ، ثناءاللہ، کشمیر 1947 سے 1977 تک، سری نگر: علی محمد اینڈ سنز، 1980ء۔

بزاز، پریم ناتھ، کشمیر میں جدوجہد آزادی، سری نگر: کشمیر پبلشر کمپنی، 1954ء۔

پردیسی، پریم ناتھ، میں اور میرے افسانے، جموں: راج محل پبلشرز، 1958ء۔

پریمی، برج، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، جموں، رچنا پبلی کیشنز، 1992۔

پریمی، برج، کشمیر کے مضامین، سری نگر: دیپ پبلی کیشنز، 1989۔

ٹینگ، محمد یوسف، سازکی لے کو تیز کرو، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1979۔

ٹینگ، محمد یوسف، ہمارا ادب، جموں اینڈ کشمیر: اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1969۔

حسین، سید احتشام، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 1997۔

حسین، سید احتشام، روایت اور بغاوت، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکاڈمی، 2005۔

خاکی، مسعود رضا، اردو افسانے کا ارتقا، لاہور: مکتبہ خیال، 1987۔

خیال، غلام نبی، اقبال اور تحریک آزادی کشمیر، لاہور: اقبال اکادمی، ب۔ت۔

رومانی، پریمی، اظہار، جموں: رچنا پبلی کیشنز، 2007۔

ریحانہ، نگہت، اردو مختصر افسانہ: فنی وتکنیکی مطالعہ، دہلی: کلاسیکل پرنٹرس، 1982۔

ساگر، رامانند، آئینے، لاہور: لاج پت رائے اینڈ سنز، 1944۔

ساگر، رامانند، اور انسان مرگیا، بمبئی: نو ہند پبلشرز لمیٹیڈ، 1948۔

سروری، عبد القادر، کشمیر میں اردو (جلد اول)، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1980۔

سروری، عبد القادر، کشمیر میں اردو (جلد دوم) سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، 1982۔

سروش، رفعت، یادوں کا دریچہ، دہلی: اردو اکادمی، 2010۔

شہاب، قدرت اللہ، سرخ فیتہ، دہلی: دارالاشاعت مصطفائی، 2014۔

شہاب، قدرت اللہ، یا خدا، لاہور: مکتبہ جدید، 1951۔

صدیقی، عتیق، شیخ عبد اللہ کشمیر اور ہم، دہلی: مکتبہ شاہراہ، ب۔ت۔

صدیقی، عظیم الشان، اردو افسانہ فکری وفنی جہات، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2010۔

عبداللہ، شیخ محمد، آتش چنار، سری نگر: علی محمد اینڈ سنز، 1982۔

عبداللہ، شیخ محمد، کشمیر ہندوستان اور پاکستان، سری نگر: علی محمد اینڈ سنز، ب۔ت۔

عظیم، سید وقار، فن افسانہ نگاری، نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، 1977۔

فاروقی، شمس الرحمٰن، افسانے کی حمایت میں، نئی دہلی: جامعہ لمٹیڈ 2006۔

فتح پوری، فرمان، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1982۔

کاشمیری، حامدی، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، سری نگر: گلشن پبلشرز، 1991۔

منصور، منصور احمد، موج قلم، سری نگر: میزان پبلشرز، 2011۔

نارنگ، گوپی چند، اردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2000۔

رسائل و جرائد:

شمیم، شمیم احمد، پریم ناتھ در میرا یار نمبر (1)، روزنامہ آئینہ، 10 ستمبر 1976۔

شمیم، شمیم احمد، پریم ناتھ در میرا یار نمبر (2)، روزنامہ آئینہ، 11 ستمبر، 1976۔

شمیم، شمیم احمد، جموں و کشمیر میں آزادی کے بعد اردو زبان و ادب، شیرازہ (ماہنامہ)، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز نومبر 1973۔

در، پریم ناتھ، کشمیری شخصیت، آج کل، جلد 14، نمبر 1، کشمیر نمبر، 1955۔

شیرازہ، سری نگر: جموں اینڈ کشمیر آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز جلد 15، شمارہ 4، 1971۔

ہمارا ادب (شخصیات نمبر 2)، 1982۔

PREM NATH DAR KI AFSANA NIGARI

(THE SHORT STORY OF PREM NATH DAR)

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirement for
the award of the Degree of

Master of Philosophy

Submitted by
Sunil Kumar

Under the Supervision of
Prof. Mazhar Hussain Mehdi

Centre for Indian Languages
School of Languages, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi -110067

2018